Regd. L. No. 7243

Phone 380800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جون 1984

اس پرچہ میں

سود

حلال بھی – اور – حرام بھی

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ 4 روپے

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماھنامہ ـــــ لاھور

قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون :۔ ۸۸۰۸۰۰	بدل اشتراک
۴	خط و کتابت	سالانہ
چار روپے	ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔بی گلبرگ ۲، لاہور	پاکستان /۴۸ روپے
		غیر ممالک /۹۶ روپے
شمارہ ۶	جون ۱۹۸۴ء	جلد ۳۷

۱۔ لمعات۔ اسلامی مملکت سے متعلق مختلف سوالات (پرویز صاحب) ۲
۲۔ سود۔ حلال بھی اور حرام بھی! (پرویز صاحب) ۱۰
۳۔ چارمرگ۔ بیادِ اقبالؒ (پرویز صاحب) ۲۵
۴۔ روزوں کا مقصد (قرآن کی رُو سے) ۳۹
(پرویز صاحب کا ایک درسِ قرآن)
۵۔ طاہرہ کے نام خط (ایک دیرینہ سلسلہ کی تجدید) (پرویز صاحب) ۴۵
۶۔ حمل اور رضاعت کی مدّت ۵۷
(ایک اہم سوال کا اطمینان بخش حل)
محترم ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب
۷۔ تبویب القرآن کا تازہ ایڈیشن ۶۴

ایڈیٹر محمد خلیل، ناشر شیخ عبدالمجید۔ مقام اشاعت ۲۵۔ بی گلبرگ ۲، لاہور۔ مطبوعہ اشرف پرنٹنگ پریس ۷۔ ایبک روڈ لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

لمعات

اسلامی مملکت سے متعلق مختلف سوالات۔

پرویز

میرے ہاں، پاکستان اور بیرونی ممالک کے ارباب فکر و دانش اکثر آتے رہتے ہیں، اور چونکہ میرا تعارف، قرآن کے طالب علم ہونے کی جہت سے ہوتا ہے اس لئے اکثر موضوع گفتگو قرآن مجید کے حقائق و معارف ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ میں نے تحریک پاکستان میں بھی (اپنی استطاعت کے مطابق) حصہ لیا تھا اور جس مقصد کے لئے یہ خطہ زمین حاصل کیا گیا تھا، وہ میرے لئے جزو ایمان کی حیثیت رکھتا ہے؛ اس لئے اکثر سوالات اس موضوع سے بھی متعلق ہوتے ہیں، بالخصوص سابقہ دنوں میں جب (اس موضوع) نے خصوصی اہمیت حاصل کر لی۔ ان سوالات اور ان کے جوابات کی اہمیت کے پیش نظر میں نے مناسب سمجھا ہے کہ قارئین طلوعِ اسلام کو بھی اس شغل میں شریک کر لیا جائے۔ ذیل میں ان سوالات اور ان کے جوابات کو ملخصاً درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ سوال:۔ آپ کو علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کا قرب حاصل رہا ہے۔ کیا آپ بتائیں گے کہ حصول پاکستان سے ان کا مقصد کیا تھا؟

جواب:۔ مجھے یا کسی اور کو ان حضرات سے قرب حاصل رہا ہو یا نہ، وہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں اس قدر وافر سرمایہ چھوڑ گئے ہیں کہ اس کی روشنی میں اس امر کا متعین کرنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ حصولِ پاکستان سے ان کا مقصد کیا تھا۔ میں اس موضوع پر جب بھی لب کشائی کرتا ہوں تو اس بناء پر نہیں کہ "مجھے ان سے قرب حاصل رہا ہے"! میں ان کی تحریروں اور تقریروں کے حوالے سے بات کرتا ہوں کہ یہی اس باب میں سند یا اعتمادی ہیں، نہ کہ (میرا یا کسی اور کا) ذاتی علم۔ ذاتی علم و روایات کی حیثیت رکھتا ہے جسے (بلاسند) قابل اعتماد شہادت تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ میں ان کی تحریروں اور تقریروں سے (جو منضبط ہو چکی ہیں) یہ ثابت کرتا چلا آ رہا ہوں کہ ان کا مقصد، اس خطۂ زمین میں ایسی مملکت قائم کرنا تھا جس میں حکمرانی خدا کی کتاب کی ہو۔ اسی کو اسلامی مملکت کہا جاتا ہے۔

۲۔ سوال:۔ کیا انہوں نے کتاب اللہ کی حکمرانی کی عملی شکل کے متعلق کچھ وضاحت کی تھی؟

جواب:۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات تشکیل جدید کے چھٹے خطبہ میں بالخصوص، بڑی

تفصیل سے لکھا ہے کہ اس کی عملی شکل کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ قرآن کے احکام، اصول و اقدار سب غیر متبدل ہیں۔ ان میں نہ کسی قسم کا تغیر و تبدل کیا جا سکے گا، نہ حسک و اضافہ۔ ان کے نفاذ کے طریق (جسے جزئی قوانین کہہ لیجئے) قوم (امت) کے باہمی مشورہ سے طے پائینگے۔ اس باب میں یہ مملکت کسی سابقہ دور کی مملکت کے فیصلوں کی پابند نہیں ہوگی۔ ہر دور کی مملکت اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، ان قوانین کے مدون کرنے کی مجاز ہوگی کیونکہ تدبر فی القرآن اور مشاورت کسی دور کے ساتھ مختص نہیں۔ یہ پابند صرف اس بات کی ہوگی کہ اس کا کوئی فیصلہ قرآن کریم کی حدود سے نہ ٹکرائے۔ میں اس موضوع پر بڑی تفصیل سے لکھتا چلا آ رہا ہوں۔ علامہ اقبالؒ نے اس باب میں حدیث اور فقہ کے متعلق بھی کافی بحث کی ہے۔ قائداعظمؒ نے اس حقیقت کی وضاحت اس قسم کے جامع الفاظ میں کر دی تھی کہ "ہماری پابندی اور آزادی کی حدود خدا کی کتاب نے متعین کر دی ہیں۔ حکمرانی اسی کی ہوگی"۔

۳۔ سوال:۔ کیا تحریک پاکستان کے دوران اس قسم کا کوئی ریزولیشن پاس ہوا تھا کہ پاکستان، اقبالؒ یا قائداعظمؒ کے تصور کی اسلامی مملکت ہوگا۔

جواب:۔ وہاں اس قسم کے ریزولیشن کی ضرورت کیا تھی؟ وہاں انگریز اور ہندو چاہتا تھا کہ پورے ہندوستان کو ایک وحدت کی حیثیت سے مملکت قرار دیا جائے۔ مطالبہ پاکستان کا مقصد یہ تھا کہ اس ملک کے ایک حصہ کو الگ کر کے اس میں مسلمان اپنی مملکت قائم کریں۔ وہاں اس کے لئے ریزولیشن پاس ہوتے رہتے تھے تاکہ انگریز اور ہندو (اور باقی دنیا) پر واضح ہو جائے کہ ہمارا مطالبہ کیا ہے۔ ان حضرات نے البتہ وہاں مسلمانوں کو بتا اور سمجھا دیا تھا کہ مطلوبہ مملکت قرآنی ہوگی ـــ اور اس حقیقت کو سمجھایا گیا تھا اس تکرار و اصرار کے ساتھ کہ ہندوؤں تک پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو گئی تھی۔ یہ مسلمانوں کے ایمان کا تقاضا اور اسلام کا مطالبہ تھا جس کے لئے کسی ریزولیشن کی ضرورت نہیں تھی (طلوعِ اسلام کے سنہ ۱۹۳۸ء کے دور کے فائل اس پر شاہد ہیں)۔ چونکہ "اسلامی مملکت" کے الفاظ سے اس قسم کا شبہ یا ابہام ہو سکتا تھا کہ اس سے شاید مراد تھیا کریٹک حکومت ہے، تو اس کی وضاحت کر دی گئی تھی کہ پاکستان میں تھیاکریسی کا کوئی دخل نہیں ہوگا جس میں (بقول قائداعظمؒ) مذہبی پیشوا خدا کے نام پر اپنا اقتدار قائم کرتے ہیں۔

۴۔ سوال:۔ ریزولیشن نہ سہی پاکستان کی مطلوبہ مملکت اور اس میں اندازِ حکومت کے متعلق قائداعظمؒ اپنے رفقاء سے تو باتیں کرتے ہی ہوں گے! کیا آپ اس پر کچھ روشنی ڈال سکیں گے؟

جواب:۔ دراصل یہ ہے کہ یہاں اس امر کا اندازہ ہی نہیں کیا جاتا کہ قائداعظمؒ کس قدر

مصروف رہتے تھے اوران کی مصروفیات کی نوعیت کیا تھی؟ وہ تین محاذوں پر اکیلے لڑائی لڑ رہے تھے (یعنی انگریز۔ ہندو اور تحریک پاکستان کے مخالف مسلمان جن میں نیشنلسٹ علماء پیش پیش تھے۔ یہ جنگ تیغ وسناں کی نہیں تھی (بلکہ) سیاست کی تھی۔ انگریز میکیاولی سیاست کا گرگ باراں دیدہ اور ہندو کوٹلیا کی فریب کارانہ چالوں کا ماہر (کوٹلیا کا نام تو چانکیہ تھا لیکن وہ فخر سے اپنے آپ کو کوٹلیا کہتا تھا جس کے معنی "مکّار اور فریب کار" کے ہیں۔ ہندو بھی اسے اسی لقب سے پکارتے ہیں۔ ہندو سیاست کی بنیاد اسی کے "ارتھ شاستر" پر ہے) ان دونوں کی روباہ بازیاں اور کانگریسی علماء کی خدا کے نام پر عوام کو تحریک پاکستان کے خلاف بھڑکانے کی اشتعال انگیزیاں یہ ان کا متحدہ محاذ تھا اور اس کے مقابلہ کے لئے تنہا قائداعظمؒ جس کا ساز وسامان (بقول ان کے) ایک ٹائپ رائیٹر اور ایک اٹیچی کیس تھا۔ آپ سوچئے کہ کیا ان حالات میں انہیں اس کی فرصت مل سکتی تھی کہ وہ ان امور کی تفصیلات کے متعلق بیٹھے باتیں کرتے رہتے جن کی اس وقت نہ کوئی عملی حیثیت تھی، نہ اس جنگ سے کوئی واسطہ۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں بلبل چہ گفت، وگل چہ شنید و صبا چہ کرد؟

ہم تو حیران ہوا کرتے تھے کہ مٹھی سے جسم میں جانِ ناتواں، اس قسم کے دشمنوں کا مقابلہ کس طرح کرتی تھی۔ اور مقابلہ بھی ایسا کہ اگر ان کے دام ہمرنگ زمین کی کوئی ایک کڑی بھی نگاہ سے اوجھل ہو جائے تو جیتی ہوئی بازی ہر جائے۔ ان حالات میں یہ سمجھنا کہ انہیں ایک متوقع مملکت کی مفروضہ حکومت کی تفصیلات طے کرنے کے لئے فرصت مل جاتی ہوگی، حقائق سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ اس وقت تو ساری کوششیں اور کاوشیں اس ہدف پر مرکوز تھیں کہ کسی طرح پاکستان کے لئے الگ خطہ زمین مل جائے اگر وہ مجھ سے قرآنی حقائق کے متعلق گفتگو کرنے کے لئے وقت نکال لیا کرتے تھے، تو وہ بھی اس جنگ کی ضرورت تھی۔ ہندو اور نیشنلسٹ علماء اسلام کو مذہب کی حیثیت سے پیش کرتے تھے جس کے لئے مسلمانوں کی الگ مملکت کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے برعکس مطالبہ پاکستان کی بنیاد اس حقیقت پر تھی کہ اسلام مذہب نہیں، دین ہے، جو صرف اپنی آزاد مملکت میں قائم ہو سکتا ہے۔ قائداعظمؒ اس بنیادی اصول سے تو بہرہ ور تھے لیکن اس کی تائید میں قرآنی دلائل و براہین لا نہیں سکتے تھے، وہ اس کی ضرورت کو سمجھتے تھے اس لئے اس کے لئے (یوں کہئے کہ) میدان جنگ میں بھی وقت نکال لیا کرتے تھے۔ جہاں تک اس مملکت کے مقصود و مطلوب کا تعلق تھا وہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں اس کا اعلان کرتے رہتے تھے اور جو کچھ اس طرح برملا کہتے وہی کچھ اپنے رفقا کے ساتھ گفتگو میں دہراتے۔

۵۔ سوال: حصولِ پاکستان کے بعد تو قائداعظمؒ ایسا آئین مرتب کر سکتے تھے جو ان کے مقصد کا مظہر ہوتا۔ انہوں نے ایسا کیوں نہ کیا؟

جواب: (مستفسر سے) معلوم نہیں تشکیل پاکستان کے وقت آپ کی عمر کیا تھی؟ اگر آپ کو معلوم اور یاد ہوتا کہ اس وقت پاکستان اور اسی نسبت سے قائداعظمؒ کس قسم کے قیامت خیز حادثات اور حوصلہ شکن سانحات میں گھرے ہوئے تھے تو آپ کو اس سوال کے پوچھنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ اس وقت کیفیت یہ تھی کہ ہندو تہیہ کئے ہوئے تھا کہ پاکستان کے وجود کو ختم کر دے گا۔ اس نے پاکستان کے حصے میں آنے والے اس روپے کو روک لیا تھا جس سے اس نوزائیدہ مملکت نے سانس لینا تھا، نہ فوج تقسیم ہوئی تھی نہ اسلحہ۔ "پاکستانی فوج" کی حالت یہ تھی کہ قائداعظمؒ نے بحیثیت گورنر جنرل اسکے انگریز کمانڈر کو حکم دیا کہ کشمیر میں فوج بھیجدے، اور اس نے صاف انکار کر دیا اور قائداعظمؒ بے بس ہو کر رہ گئے۔ کشمیر کا نصفہ ایک طرف، حیدرآباد، جونا گڑھ کے مسائل اس پر مستزاد۔ پھر ہندوستان سے مسلمان پناہ گزینوں کا لاکھوں کی تعداد میں سیلاب کیطرح ہجوم۔ لٹے پٹے، نہ کھانے کو روٹی نہ پہننے کو کپڑا، نہ سر پہ چھت۔ تمام راستے سربریدہ لاشوں سے پٹے پڑے ہزاروں کی تعداد میں، باعصمت نوجوان بیٹیاں، وحشی درندوں کے قبضے میں۔ پاکستان میں ہندو اقلیتوں کی طرف سے ہر وقت خطرہ کہ ہندوستان کا ہندو ان کے تحفظ کی آڑ میں نہ جانے کیا قدم اٹھائے۔ خود ہندوؤں کی ایک اطلاع کے مطابق حکومت ہند، دسمبر ۱۹۴۷ء میں پاکستان پر حملہ کرنے کی سوچ رہی تھی۔ ان حوادث اور تفکرات نے قائداعظمؒ کے اس مہلک مرض کے سوزِ نہاں کو جسے وہ اپنی قوتِ ارادی کے بل بوتے پر، اس وقت تک دبائے چلے آ رہے تھے، شعلہ کی طرح بھڑکا دیا۔ وہ زندہ نہیں تھے، بس سانس گن رہے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے انتظامی ذمہ داریوں کے کوہ گراں کو کسی نہ کسی طرح اٹھائے رکھا تا آنکہ موت کے جھکڑ نے اس شمع کو گل کر دیا۔

آپ سوچئے کہ کیا ان حالات میں اسکی فرصت مل سکتی تھی کہ وہ پاکستان کے لئے آئین مرتب کرتے۔ ان کا اتنا احسان ہی کیا کم ہے کہ انہوں نے جان دیکر اس خطہ ارض کو محفوظ رکھا اصل یہ ہے کہ جن لوگوں نے تحریک پاکستان کی مخالفت میں، قائداعظمؒ کے ہاتھوں شکست کھائی تھی وہ اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لئے اس قسم کے شکوک ابھارتے اور انہیں بدنام کرنے کے لئے اعتراضات وارد کرتے رہتے ہیں۔ احسان ناشناس قوم کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ مخالفین تحریک پاکستان کا جو ہجوم ادھر آ گیا تھا ان کی انتہائی کوشش ہے کہ اس مملکت کو ناکام کر دیا جائے، اور پھر فخر سے کہا جائے کہ ـــــ کیوں! ہم نہ کہتے تھے!! خدا اس خطۂ زمین کو ان کے مذموم عزائم سے محفوظ رکھے۔

(۶) سوال:۔ یہ تو قائداعظمؒ کے متعلق ہوا۔ جو لوگ تحریکِ پاکستان میں ان کے ساتھ تھے انہوں نے بھی تو اس ضمن میں کچھ نہ کیا؟

جواب:۔ یہ سوال ان سے پوچھنے میں تو اتنا ہی جانتا ہوں کہ وہ یہاں (بہ حیثیت مجموعی) مالِ غنیمت پر پل پڑے اور اسی کی تقسیم میں کھو گئے۔ بقولِ اقبالؒ۔ زاغوں کے تصرف میں ہے شاہیں کا نشیمن (صدرِ اوّل کے بعد) ہماری ساری تاریخ اسی المیہ کی مظہر ہے۔

(۷) سوال:۔ اسے چھوڑیئے کہ ان لوگوں نے وہ کچھ نہیں کیا جو اقبالؒ اور قائداعظمؒ کا مقصود اور مطلوب تھا۔ سوال یہ ہے کہ اگر ہم اب اس مملکت کو (ان کے تصور کی) اسلامی مملکت بنانا چاہیں تو اس کی ابتدا کہاں سے کرنی چاہیئے؟

جواب:۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں اسلامی مملکت کی امتیازی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں حکمرانی خدا کی کتاب کی ہوتی ہے۔ اس کے لئے دستورِ پاکستان میں سرِ فہرست یہ شق رکھنی چاہیئے کہ مملکت میں حکمرانی کتاب اللہ کی ہوگی یعنی اس کا تمام کاروبار قرآن مجید کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائے گا۔ مملکت کا فریضہ قرآنی قوانین و احکام و اصول و اقدار کو نافذ کرنا ہوگا اور اس کے نفاذ کے طور طریق امت (قوم) کی مشاورت سے طے پائیں گے۔ اس میں قانون سازی کا حق کسی انسان یا انسانوں کی جماعت کو حاصل نہیں ہوگا۔

(۸) سوال:۔ اس میں حصول اقتدار کا طریقہ کیا ہوگا؟

جواب:۔ اس میں جب کسی انسان کو اقتدار حاصل ہی نہیں ہوگا۔ تو حصولِ اقتدار کا سوال کہاں سے پیدا ہوگا۔ اس میں البتہ انتظامیہ کے لئے مشینری یا سربراہ کی ضرورت ہوگی۔ اس کا انتخاب قرآن کے غیر متبدل اصولِ مشاورت کی رُو سے ہوگا۔ مشاورت کا طریق بھی مشاورت باہمی سے طے پائے گا اور مشاورت ہی سے تبدیل کیا جا سکے گا۔ اصل یہ ہے کہ جب اس میں اقتدار نہیں ہوگا، محض ذمہ داریاں ہی ہوں گی تو اس انتخاب یا تقرر میں کوئی پیچیدگی پیدا نہیں ہوگی۔ ذمہ داری کا احساس رکھنے والوں کو تو امت "زبردستی" اس کے لئے آمادہ کیا کرتی ہے۔ اس کے لئے تو حضرت عمرؓ جیسوں نے کہدیا تھا کہ اگر مجھے خلیفہ رسول اللہؐ کی حکم عدولی گوارا ہو سکتی تو میں ہرگز یہ ذمہ داری قبول نہ کرتا۔ زمین پہ سونا اور جو کی روٹی اس وقت کھانا جب اطمینان ہو جائے کہ مملکت کے ہر فرد کو روٹی مل گئی ہے۔ اس کے لئے کون لپک کر آئے گا؟

(۹) سوال:۔ کہا جاتا ہے کہ اقتدار خدا کی طرف سے ملتا ہے اس لئے صاحبِ اقتدار مامور من اللہ ہوتا ہے اس عقیدہ کی رُو سے اس میں امت (قوم) کا کوئی دخل ہی نہیں ہوتا۔ اس کی کیا حقیقت ہے؟

جواب:۔ سب سے پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ مامور من اللہ خدا کے رسول ہوتے تھے۔ ختم نبوت کے بعد

ماموریت من اللہ کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔

اس قسم کے عقائد کہ حکومت اور محکومیت، عزت اور ذلت، غریبی اور امیری، مصیبت اور آسائش، سب خدا نے اختیار میں ہے۔ وہ جسے چاہے دے جس سے چاہے چھین لے۔ کسی انسان کو اس میں کسی قسم کا اختیار نہیں اور خدا کے فیصلوں کے خلاف، لب کشائی کرنا تو ایک طرف دل میں بھی کبیدگی پیدا ہونا مرضیٔ مولا کے خلاف سرکشی ہے۔ اس قسم کے عقائد ہمارے دورِ ملوکیت کے پیدا کردہ ہیں۔ یہ سلاطین قوت یا وراثت کی رُو سے برسرِ اقتدار آتے اور ہر قسم کی من مانی کرتے رہتے۔ اس کے لئے ان کے پاس نہ کوئی وجہ جواز تھی، نہ دلیل و برہان۔ محکوموں مظلوموں، غریبوں اور مفلسوں، محتاجوں اور ناداروں کو مطمئن رکھنے کے لئے اس قسم کے عقائد وضع کئے گئے تاکہ وہ ظلم و استبداد کے خلاف سر اٹھانے کا سوچ تک نہ سکیں۔ رئیس نے اپنی تصنیف کتاب التقدیر میں ان عقائد پر تفصیلی بحث کی ہے۔ ملوکیت، قوم کی سوچ پر پہرے بٹھا دیتی ہے۔ اگر انہیں آزادی فکر ہوتی تو وہ اس قسم کے عقائد کو کبھی تسلیم نہ کرتی۔ وہ سوچتی کہ اگر حقیقت یہی ہے کہ حکومت اور سلطنت خدا کی عطا کردہ ہوتی ہے تو یہ کیوں تھا کہ ایک طرف خدا نے فرعون کو سلطنت اور حکومت عطا کی اور دوسری طرف (حضرت) موسیٰؑ سے کہا کہ جاؤ، اور حکومت اور سلطنت اس مستبد سے چھین لو۔ جب تک امت کے سامنے قرآن رہا، وہ جانتی تھی کہ مملکت پوری کی پوری قوم (امت) کی ہوتی ہے اور اس کا نظم و نسق امت ہی کی صوابدید کے مطابق (مشاورت سے) طے پاتا ہے۔ سربراہ مملکت امت ہی کے مشورہ سے منتخب ہوتا ہے اور اس وقت تک اس منصب پر سرفراز رہتا ہے جب تک امت اس پر متفق ہو۔ صدرِ اوّل میں ارباب اقتدار اس قدر محتاط تھے کہ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کو کسی نے (ماموریت من اللہ نہیں) خلیفۃ اللہ کہہ کر پکارا تو انہوں نے اسے فوراً ٹوک دیا اور کہا کہ میں خلیفۃ اللہ نہیں۔ خلیفۃ الرسول (رسول اللہ کا جانشین) ہوں۔ مجھے یہی کہہ کر پکارا جائے (شاہکار رسالت ص۵۹) انہوں نے اپنے پہلے خطبۂ خلافت میں اعلان کر دیا تھا کہ تم میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کروں۔ اگر مجھ سے ایسا کام سرزد ہو جس سے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کا پہلو نکلتا ہو تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں (شاہکار رسالت ص۵۸) حضرت عمرؓ نے بھی اسی حقیقت کو دہرایا تھا جب کہا تھا کہ رعیت اس وقت تک امیر کی اطاعت کرتی ہے جب تک وہ خدا کی اطاعت کرتا ہے (الفاروق ص۲۱۵) اور وہ واقعہ تو مشہور ہے کہ جب آپ منبر پر کھڑے قوم کو ہدایات دے رہے تھے اور آپ پر ایک اعتراض ہوا تو آپ خود ہی منبر (مسندِ اقتدار) سے نیچے اتر آئے اور منبر پر تشریف نہیں لے گئے جب تک لوگ مطمئن نہیں ہو گئے۔

ان شواہد کے پیش کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ جب تک مملکت اسلامی رہی، نہ سربراہ مملکت

کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اسے اقتدار خدا نے دیا ہے۔ امت کا اس میں کچھ اختیار نہیں۔ نہ ہی امت نے یہ سمجھا کہ سربراہ مملکت خدا کا مقرر کردہ ہے اس لئے ہمیں اس کے تقرر اور تنزل کا کوئی حق حاصل نہیں۔ وہ دونوں جانتے تھے کہ یہ سب کچھ امت (قوم) کی صوابدید کے مطابق طے پائیگا۔ اس باب میں امت کا ذہن اس قدر صاف تھا کہ جب ایک حاکم نے کہا کہ بیت المال کا مال خدا کا مال ہے اس لئے ہم صرف خدا کے ہاں جوابدہ ہوں، تو ایک صحابیؓ نے اسے فوراً ٹوک دیا اور کہا کہ بیت المال مسلمانوں کا مال ہے اور تم ان کے سامنے جوابدہ ہو (الفتنۃ الکبریٰ۔ طٰہٰ حسین۔ اردو ترجمہ صفحہ ۳۱)

(۱۰) سوال: اس مقام پہ ایک سوال دل میں ابھرتا ہے۔ بہتر ہے کہ اس کی وضاحت اسی مقام پہ ہو جائے۔ کہا جاتا ہے کہ جب شورشیوں نے حضرت عثمانؓ کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور ان سے مطالبہ کیا کہ وہ از خود خلافت سے دستبردار ہو جائیں تو انہوں نے کہا تھا کہ "جو قمیص مجھے اللہ نے پہنائی ہے میں اسے خود کیسے اتار دوں؟" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خلافت کو خدا کی عطا کردہ سمجھتے تھے۔

جواب: یہ بادنیٰ تعمق یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان کی طرف یہ قول غلط منسوب ہوا ہے۔ (جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے)۔ یہ عقیدہ دور ملوکیت کا وضع کردہ ہے۔ حضرت عثمانؓ کی طرف اس کی نسبت اس لئے غلط نظر آتی ہے کہ وہ جانتے تھے کہ انہیں خلافت کے لئے انسانوں پہ مشتمل اس کمیٹی نے منتخب کیا تھا جو اس مقصد کے لئے تشکیل کی گئی تھی اور اس کے بعد امت نے اس انتخاب کی توثیق کی تھی۔ پھر ان کے سامنے ان کے دونوں پیشروؤں (حضرت صدیق اکبرؓ اور عمر فاروقؓ) کے ارشادات موجود تھے کہ ان کی خلافت کا انحصار امت کی صوابدید پر ہے۔ ان شواہد کے علاوہ، ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ آخری وقت میں خلافت سے دستبرداری کے لئے تیار تھے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> بعض روایات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عثمان آخر الامر ایک گونہ عافیت پسندی کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ حضرت عثمانؓ کے ہاں گئے۔ ان سے بات چیت کی۔ پھر وہ حضرت علیؓ کی تلاش میں نکلے اور مسجد نبویؐ میں انہیں پالیا۔ حضرت سعدؓ نے کہا۔ "اے ابو الحسنؓ! میں تمہارے پاس ایسی بہترین تجویز لایا ہوں جس سے بہتر کوئی حل پیش نہیں کیا جا سکتا اور وہ یہ ہے کہ آپ کے خلیفہ نے اپنی مرضی آپ لوگوں کے حوالے کر دی ہے۔ دوڑیئے! ان کی مدد کیجئے۔ اس فضیلت میں سبقت فرمایئے لیکن ابھی دونوں کی یہ سرگوشی جاری تھی کہ حضرت عثمانؓ کے قتل کی خبر آ گئی۔ (صفحہ ۲۲۴)

اس کے بعد ڈاکٹر طٰہٰ حسین لکھتے ہیں:-

مجھے یقین کی حد تک اعتقاد ہے کہ حضرت عثمانؓ نے حضرت سعدؓ کو بلوا کر انہیں اپنے اور حضرت علیؓ کے مابین سفارت پر آمادہ کیا ہوگا تاکہ لوگوں کو قتل و قتال سے روک دیا جائے اور شرط یہ طے پائی ہوگی کہ خلافت کا معاملہ مسلمانوں کے اصحاب شوریٰ اور ارباب حل و عقد کے سپرد کر دیا جائے تاکہ وہ جسے چاہیں خلافت کا عہدہ سونپ دیں۔ (ص ۲۷۴)

میں، عہد اول کی تاریخ کے اس نازک ترین حادثہ پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے ان شواہد کو اس لئے پیش کیا ہے کہ یہ واضح ہو جائے کہ حضرت عثمانؓ بھی خلافت کو امت کے انتخاب پر منحصر سمجھتے تھے اور ان کی طرف اس قول کی نسبت صحیح نہیں کہ یہ خدا کی پہنائی ہوئی قمیص ہے!!

(۱۱) سوال:۔ ان تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام کا سیاسی نظام جمہوریت ہے۔ کیا ایسا سمجھنا صحیح ہے؟

جواب:۔ مروجہ سیاسی یا معاشی اصطلاحات کو "اسلامی" کہنے کے لئے بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ یہ اصطلاحات ایک خاص مفہوم اپنے اندر لئے ہوتی ہیں۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ وہ مفہوم اسلام (یعنی قرآن) کے مطابق ہے یا نہیں۔ مغربی (یا سیکولر) جمہوریت کا مفہوم یہ ہے کہ اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں اور ان کے نمائندگان کو قانون سازی کا کلی (اور مطلق) اختیار حاصل ہے۔ یہ نظریہ قرآنی تصور سیاست کے یکسر خلاف ہے۔ قرآن کی رُو سے اقتدار کا سرچشمہ نہ عوام ہیں نہ خواص۔ اقتدار کا سرچشمہ صرف کتاب اللہ ہے اور امت کا فریضہ اس کی حکمرانی کو بروئے کار لانا ہے۔ اس فریضہ کو امت باہمی مشاورت سے سر انجام دے گی۔ دنیائے سیاست کی مروجہ اصطلاحات میں سے کوئی اصطلاح بھی اس نظام کا مفہوم ادا نہیں کر سکے گی۔ "جمہوریت" کی اصطلاح اس باب میں سب سے زیادہ مغالطہ آفرین ہے کیونکہ اس میں (بظاہر) "مشاورت" سے مماثلت پائی جاتی ہے۔ اور یہ مماثلت دام ہمرنگ زمین ہے۔ یوں سمجھئے کہ مغربی جمہوریت پر کسی قسم کا کنٹرول نہیں ہوتا۔ اور اسلامی مشاورت (یعنی اسلامی مملکت کے نظام مشاورت) پر کتاب اللہ کا کنٹرول ہوتا ہے۔

خریدار صاحبان متوجہ ہوں

(۱) بسا اوقات ادارہ ہذا کے نام جو منی آرڈر موصول ہوتے ہیں ان کے کوپنز (COUPONS) پر خریدار کا مکمل پتہ نہیں لکھا ہوا ہوتا۔ اس کا خاص خیال رکھا جائے تاکہ تعمیل میں بلا وجہ تاخیر نہ ہو۔

(۲) پرچہ نہ ملنے کی اطلاع خریدار ماہ رواں کی پندرہ تاریخ تک بھیج دیں۔ اس صورت میں ہی پرچہ دوبارہ ارسال کیا جائیگا۔

(۳) جواب طلب امور کے لئے جوابی لفافہ ارسال کریں۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

سُود

(حلال بھی اور حرام بھی!)

پرویز

قرآن کریم کی تعلیم کا مقصود و مطلوب، انسانوں کو انسانوں کی غلامی و محکومی سے آزاد کرانا ہے۔ اس غلامی کو تین بنیادی شکلوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ سیاسی غلامی (وہ دور کہن کی شاہنشاہیت ہو یا عصر حاضر کی آمریت یا مغربی جمہوریت)۔ اقتصادی غلامی (جسے نظام سرمایہ داری کہہ کر پکارا جاتا ہے) اور ذہنی غلامی (جو مذہبی پیشوائیت کی فرمانروائی کی شکل میں سامنے آتی ہے اور اسے مقہا کریسی سے تعبیر کیا جاتا ہے)۔ اسلام کے صدرِ اوّل میں جب قرآن کی حکمرانی قائم ہوئی تو غلامی کی ہر زنجیر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور نوعِ انسان اس حقیقی آزادی سے ہمکنار ہوئی جسے قرآن نے ان چند الفاظ میں سمو دیا ہے کہ یَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا۔ جس دور میں کسی انسان کو دوسرے انسان پر کسی قسم کا کنٹرول نہیں ہوگا۔ کوئی کسی کا دبیل نہیں ہوگا۔ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلَّهِ (۸۲/۱۹) اور حکمرانی کاملتہً قوانین خداوندی کی ہوگی۔

صدرِ اوّل کے بعد ملوکیت در آئی اور اس کے ساتھ ہی اس کے لزومات، نظامِ سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت بھی۔ ان تینوں کا تقاضا اپنے اپنے دائرے میں "من مانی" کرنے کا تھا لیکن ان کی مشکل یہ تھی کہ یہ خود بھی مسلمان تھے۔ قوم بھی مسلمان اور خدا کی کتاب محفوظ شکل میں موجود تھی۔ یہ اس میں ترمیم و تنسیخ یا تغیر و تبدل کر نہیں سکتے تھے اور اس سے انسانوں کی کسی قسم کی حکمرانی کا جواز مل نہیں سکتا تھا۔ اس مشکل کا حل مذہبی پیشوائیت نے پیش کر دیا۔ انہوں نے قرآن کے الفاظ (اصطلاحات) کو تو بعینہٖ باقی رہنے دیا لیکن ان کا مفہوم بدل دیا۔ مفہوم کی اس تبدیلی کی سند کے لئے پہلے جعلی روایات وضع کیں اور پھر ان روایات پر مبنی فقہی قوانین مرتب کئے۔ اسلام کے معاشی نظام کے دائرے میں الربوٰ کی اصطلاح کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ انہوں نے اس کا مفہوم ایسا بدلا کہ قرآن کا معاشی نظام ہی بدل گیا۔ قرآن کے معاشی نظام کے سمجھنے کے لئے دیکھنا یہ ہوگا کہ الربوٰ کا مفہوم کیا ہے؟

الربوٰ کا مفہوم

ربوٰ کا مادہ (ر۔ب۔و) ہے جس کے بنیادی معنی زیادہ ہونا یا بڑھنا ہیں۔ استعمال کی رُو سے یہ لفظ قرآن میں سبزی کے بڑھنے پھولنے کے لئے بھی آیا ہے۔ (دیکھئے ۲۲/۵) یا ایسے بڑھنے کے لئے جو بڑھ کر اوپر چھا جائے۔ (۱۳/۱۷) اور اسطرح

چھا جائے کہ زبردست کو مغلوب کر لے سورہ الحاقۃ میں ہے۔ فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً (۶۹/۱۰) "انہوں نے خدا کے رسول کے خلاف سرکشی اختیار کی تو خدا کے قانونِ مکافات نے انہیں اس طرح پکڑا کہ وہ بے بس ہو کر رہ گئے"۔

لہٰذا ربوٰ کے معنی دولت کی ایسی بڑھوتری کے ہیں جو معاشرہ پر بُری طرح چھا جائے اور افراد معاشرہ کو اپنی سخت گرفت میں لے کر انہیں مفلوج کر کے رکھ دے۔ اسی ربوٰ پر (ال) داخل کر کے قرآن نے الربوٰ کی اصطلاح استعمال کی ہے جس سے اس کا مفہوم مختص ہو گیا۔ قرآن کریم نے جن امور یا اشیاء کو ممنوع قرار دیا ہے ان کے لئے (نہی) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یعنی روک دینا۔ منع کرنا۔ جن کی ممانعت زیادہ شدید ہے ان کے لئے حرام کا لفظ آیا ہے۔ یہی لفظ الربوٰ کے لئے آیا ہے جہاں کہا ہے۔ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (۲/۲۷۵) خدا نے ربوٰ کو حرام قرار دیا ہے الربوٰ کی ممانعت کے لئے یہی تہدید کم نہ تھی لیکن قرآن کریم نے اسے اس سے بھی زیادہ سنگین جرم قرار دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ان لوگوں سے کہدو کہ یہ الربوٰ سے باز آجائیں۔ اگر یہ باز نہ آئیں تو فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (۲/۲۷۹) پھر اللہ اور رسول (اسلامی مملکت) کیطرف سے اسے الٹی میٹم سمجھیں اور جنگ کے لئے تیار ہو جائیں۔ قرآن میں محاربت کا لفظ بغاوت کے لئے آیا ہے۔ سورۂ مائدہ میں فساد برپا کرنے والے باغیوں کے لئے کہا ہے۔ اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (۵/۳۳) "جو لوگ خدا اور رسول (اسلامی مملکت) کے خلاف جنگ پر اتر آئیں"۔ (ان کے لئے شدید ترین اور سنگین ترین سزا کا کہا گیا ہے) اگرچہ محاربت، مملکت کے خلاف باغیوں اور الربوٰ کے مرتکبین، دونوں کے سلسلہ میں ہے، لیکن ان دونوں میں بھی فرق ہے۔ باغی، مملکت کے خلاف اعلانِ جنگ کرتے ہیں، اور الربوٰ کے مرتکبین کے خلاف اعلانِ جنگ خود مملکت کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ بارگاہ خداوندی میں، الربوٰ کا ارتکاب بغاوت سے بھی زیادہ سنگین جرم ہے ——— اور اسی سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کی اس اصطلاح (الربوٰ) کا صحیح مفہوم سمجھ لینا کس قدر ضروری ہے۔ اسے سمجھنے کے لئے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ قرآن کا معاشی نظام کیا ہے؟

قرآن کا معاشی نظام

قرآن کے معاشی نظام کے بنیادی ستون حسب ذیل ہیں:۔

(۱) لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (۵۳/۳۹) معاوضہ صرف محنت کا ہے۔ لہٰذا جس نظام میں معاوضہ محنت کے بجائے سرمایہ کا ہو، وہ نظام قرآن کے خلاف ہوگا۔

محنت سے کچھ پیدا ہوتا ہے اور یہی پیداوار، محنت کش (مرد کاسب) کی محنت کا معاوضہ ہوتا ہے۔ لیکن سرمایہ کچھ پیدا نہیں کرتا، اس لئے سرمایہ کا معاوضہ کیا ہوگا؟ ایک شخص، لاکھ روپیہ

تجوری میں بند کر کے رکھ چھوڑے، وہ اسے جب بھی کھولے گا، روپیہ، لاکھ کا لاکھ ہی ہوگا۔ اس میں ایک پیسے کا بھی اضافہ نہیں ہوگا۔ کہا جائے گا کہ وہ (سرمایہ کار) اپنے روپے سے زمین خریدے، کارخانہ لگائے۔ اس زمین اور کارخانہ سے جو کچھ پیدا ہوگا، اس کا تو وہ حقدار ہوگا۔ لیکن ایسا کہنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ زمین میں کاشتکار ہل چلائیں، کارخانے میں مزدور محنت نہ کریں، تو سرمایہ کار کا سرمایہ کچھ پیدا نہیں کرے گا۔ پیداوار پھر بھی محنت ہی کی ہوگی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں

کارخانے کا ہے مالک مردکِ ناکردہ کار　　عیش کا پتلا ہے، محنت ہے اسے ناسازگار
حکمِ حق ہے لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی　　کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

صرف اصلِ زر

(۱) قرآن کریم کے معاشی نظام میں تو "سرمایہ لگانے" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا لیکن اس نے اصول یہ مقرر کیا ہے کہ ایسی صورتوں میں فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ (۲/۲۷۹)۔ تم صرف اپنا اصلِ زر واپس لے سکتے ہو۔ اس سے زائد لوگے تو وہ محنت کش کی محنت کا استحصال ہوگا۔ یہ الربٰوا ہے۔

فالتو دولت

(۲) نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد فالتو دولت (SURPLUS MONEY) پر ہوتی ہے یعنی سرمایہ کار اسی روپیہ کو (INVEST) کرسکتا ہے جو اس کی اپنی ضروریات سے زائد ہو۔ قرآن کے معاشی نظام میں کسی کے پاس فالتو روپیہ رہتا ہی نہیں۔ اس کا اصول یہ ہے کہ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ (۲/۲۱۹)۔ اے رسول! یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم اپنی کمائی میں سے کس قدر دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دیدیں؟ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زائد ہے، سب کا سب۔

قرآن کا معاشی نظام یہ ہے کہ ہر فرد کا سب اپنی استطاعت اور استعداد کے مطابق بھرپور محنت کرے، اور اس کے ماحصل میں سے بقدر اپنی ضروریات کے رکھ کر، باقی سب اسلامی نظامِ مملکت کے سپرد کردے تاکہ وہ اس سے ان لوگوں کی ضروریات پوری کرے جو محنت کرنے سے معذور ہوں، یا جن کی کمائی ان کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کافی نہ ہو۔

لہٰذا جس نظام میں افرادِ معاشرہ کے پاس فالتو دولت رہے کہ وہ اسے (INVEST) کرسکے، محنت کشوں کی محنت کا استحصال کرسکیں، وہ نظام خلافِ اسلام ہے کیونکہ اس میں الرّبٰو وصول کیا جاتا ہے۔

زمین پر ذاتی ملکیت

۳۔ جہاں تک زمین کا تعلق ہے، قرآن کریم کی رُو سے اس پر ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی، وہ نوعِ انسان کے لئے سامانِ زیست پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ اسلامی نظام ایسا انتظام کرے گا کہ زمین سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل ہو اور اس سے افرادِ معاشرہ کو سامانِ زیست میسر آئے۔ جس نظام میں زمین لوگوں کی ذاتی ملکیت ہو

اور وہ اسے کاشتکاروں کو کرایہ یا بٹائی پر دیں، وہ نظام اسلامی نظام معیشت کی ضد ہوگا اور زمیندار جو کچھ کرایہ یا بٹائی کے طور پر لے گا، وہ الربٰو ہوگا۔

لہٰذہ، جس نظام میں محنت کے بجائے، سرمایہ پر معاوضہ لیا جائے، خواہ اس کی شکل کوئی بھی کیوں نہ ہو، وہ نظام باطل ہے اور الربٰو کا حامل ہونے کی وجہ سے نہ صرف حرام قرار پائے گا بلکہ اسلامی مملکت ہیں، قرآن کے معاشی نظام کے متقابل ایک دوسرا نظام کھڑا کرنے کی بناء پر اس قابل کہ اسے (عندالضرورت) جنگ کے ذریعے ختم کر دیا جائے لہٰذہ، الربٰو اور اسلام ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

الربٰو کی مختلف شکلیں قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ نزول قرآن میں الربٰو کے نظام کی حسب ذیل شکلیں رائج تھیں، جن کا قرآن کے معاشی نظام نے خاتمہ کر دیا۔

(۱) **نجی قرضوں پر ربٰو** اس کے لئے قرآن کریم نے حکم دے دیا کہ جن لوگوں نے ایسا کاروبار کیا ہے، جو کچھ وہ مقروض سے بطور ربٰو لے چکے ہیں اسے تو معاف کیا جاتا ہے۔ وہ اپنا اصلزر واپس لے کر معاملہ کو ختم کر دیں۔ بلکہ اگر مقروض غیر ذی استطاعت ہو، تو اسے بھی معاف کر دیں۔ ($\frac{۲}{۲۷۵-۸۰}$)

(۲) **زمین کا کرایہ یا بٹائی** جب تک زمینیں مملکت کی تحویل میں نہیں آگئیں، وہ ذاتی سپرداری میں رہیں لیکن خود کاشت کے لئے کاشتکاروں سے کرایہ یا بٹائی لینا ممنوع قرار دے دیا۔ ابو داؤد کی ایک روایت میں ہے کہ

(حضرت) رافع بن خدیجؓ نے ایک زمین کاشت پر لی۔ وہ اسے پانی دے رہے تھے کہ حضورؐ کا گذر اس طرف سے ہوا۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ زمین کس کی ہے اور کھیتی کس کی؟ رافع نے کہا کہ یہ کھیتی میرے بیج اور میری محنت کا نتیجہ ہے۔ اس کا ایک حصہ میرا ہوگا اور ایک حصہ فلاں خاندان کا جس کی یہ زمین ہے۔ حضورؐ نے فرمایا، تم دونوں الربٰو کا کاروبار کر رہے ہو۔ زمین صاحب زمین کو واپس کر دو اور اپنا خرچہ اس سے وصول کر لو۔

حضورؐ کے اس فیصلہ کی مزید وضاحت کے سلسلہ میں نسائی میں ہے کہ

رسول اللہؐ سے سوال کیا گیا کہ کیا زمین کا مالک کاشتکار سے تھوڑا بہت اناج بھی لے سکتا ہے؟ فرمایا نہیں۔ پھر سوال کیا گیا۔ اچھا غلہ نہ سہی، بھوسہ تو لے سکتا ہے۔ فرمایا بالکل نہیں۔

۳ قریش میں بڑے بڑے تاجر تھے۔ ان کے تجارتی قافلے سال بھر رواں دواں رہتے تھے۔ تجارت

بیع اور الربوٰ

میں منافع حاصل ہوتا ہے۔ جب الربوٰ کی حرمت کے احکام نازل ہوئے تو سطحی بین لوگوں نے اعتراض کیا کہ جب تجارت میں سرمایہ پر بڑھوتری جائز ہے تو ربوٰ بھی جائز کیوں نہیں۔ یہ کیوں ہے کہ تجارت حلال ہے اور ربوٰ حرام (۲/۲۷۵) ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ تجارت میں سرمایہ کے ساتھ محنت بھی کی جاتی ہے۔ اس سے جو منافع ہوتا ہے وہ محنت کا معاوضہ ہوتا ہے نہ کہ سرمایہ کا، اس لئے وہ حلال ہے۔ الربوٰ میں معاوضہ سرمایہ کا ہوتا ہے اس لئے وہ حرام ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ (جس طرح آج کل عام طور پر ہو رہا ہے) لوگ اپنا روپیہ دوسروں کی تجارت میں لگا دیتے تھے اور اسی نسبت سے منافع میں حصہ دار بن جاتے تھے۔ قرآن نے کہہ دیا کہ یہ الربوٰ ہے۔ فرمایا۔

وَمَا آتَيْتُمْ مِنْ رِبًا لِيَرْبُوَ فِي أَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُو عِنْدَ اللَّهِ (۳۰/۳۹)

جو کچھ تم دوسروں کو اس لئے دو کہ اس کے بدلے میں تمہیں ان کے مال و دولت میں سے اس سے زیادہ ملے جو تم نے دیا ہے، تو ہو سکتا ہے کہ اس طرح تمہیں، تمہارے حساب کے مطابق کچھ زیادہ مل جائے، لیکن قانونِ خداوندی کی رُو سے اس سے تمہارے مال و دولت میں کچھ اضافہ نہ ہوگا۔

لہٰذہ کسی کے سرمایہ میں اپنا سرمایہ شامل کر دینا کہ اس سے منافع مل جائے، تجارت نہیں، الربوٰ ہے۔ (قرآن کے معاشی نظام میں تجارت کی شکل کیا ہوگی اسے اسلامی مملکت طے کرے گی۔ لیکن وہ بہرحال قرآن کے اس غیر متبدل اصول کو پیشِ نظر رکھے گی کہ معاوضہ محنت کا ہوگا سرمایہ کا نہیں۔ میں نے اپنی کتاب، نظامِ ربوبیت میں قرآن کے معاشی نظام کے متعلق تفصیلی بحث کی ہے اور اس کا موازنہ، کمیونزم، سوشلزم اور نظامِ سرمایہ داری سے بھی کیا ہے)

دورِ ملوکیت میں

دورِ ملوکیت آیا تو اس نے اسلامی حکومت کے پورے کے پورے نظام کو الٹ کر اس کی جگہ دورِ جاہلیت کا نظام نافذ کر دیا جسے حضور نبی اکرمؐ نے مٹایا تھا۔ ملوکیت (انسانوں کی حکمرانی) اسلام کی ضد ہے اس لئے اس میں کوئی شے بھی اسلامی نہیں ہوتی۔ اس میں اگر صحیح اسلامی قوانین بھی نافذ کر دیئے جائیں تو وہ بھی اسلامی نہیں کہلا سکیں گے۔ یہ بات آپ کو بظاہر عجیب سی نظر آئے گی لیکن بادنیٰ تدبر اس کی صداقت واضح ہو جائیگی۔ بھارت کی حکومت اگر اپنے ہاں شراب کو ممنوع قرار دے دے تو اس کے اس قانون کو اسلامی نہیں کہا جائیگا۔ قوانین کے اسلامی ہونے کے لئے حکومت کا اسلامی ہونا بنیادی شرط ہے۔ (مثال کے طور پر) اگر آپ پلاؤ کی دیگ میں چاول۔ گھی۔ مصالحہ، خالص

ڈالیں لیکن گوشت جھٹکے کا ہو تو اس پلاؤ کا کوئی دانہ بھی حلال نہیں ہوگا۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰)۔ حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ لَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهٖ اَحَدًا (۱۸/۲۶) وہ اپنے اس حق (حکومت) میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

اسلامی حکومت

کسی انسان کا دعویٰ حکومت خدا کی خدائی اور کبریائی کے خلاف چیلنج ہے۔ اس لئے واضح الفاظ میں کہدیا کہ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ کسی انسان کو اس کا حق نہیں پہنچتا، خواہ اس کے پاس ضابطہ قوانین ہو، خواہ انتظامیہ کا اقتدار، اور خواہ وہ نبی بھی کیوں نہ ہو، کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں بلکہ میرے محکوم بن جاؤ۔ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (۳/۷۹)۔ اسے یہی کہنا چاہیئے کہ اس کتاب خداوندی کے ذریعہ، جسے تم پڑھتے پڑھاتے اور سمجھتے سمجھاتے ہو، تمہیں خدا کے بندے بننا چاہیئے۔ بالفاظ دیگر، اسلام میں حکمرانی خدا کی کتاب کی ہے کسی انسان کی نہیں۔ اس کی تشریح اور تاکید سے سارا قرآن بھرا پڑا ہے، سورۂ المائدہ میں ہے۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۵/۴۵) جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، وہ ظالم ہیں۔ فاسق ہیں (۵/۴۷)۔ حتیٰ کہ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)۔ وہ کافر ہیں۔ یعنی کفر و اسلام میں حد فاصل اور خط امتیاز ہی یہ ہے۔ اگر کسی مملکت میں حکمرانی خدا کی کتاب کی ہے، تو وہ مملکت اسلامی ہے۔ اگر ایسا نہیں تو وہ مملکت غیر اسلامی ہے۔ لہٰذا ملوکیت (یعنی کتاب اللہ کی بجائے انسانوں کی حکمرانی جو قرآن کے الفاظ میں ظلم ہے۔ فسق ہے۔ کفر ہے۔ شرک ہے۔ الحاد ہے۔ بدعت ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

ہنوز اندر جہاں آدم غلام است — نظامش خام و کارش ناتمام است
غلام فقر آں گیتی پناہم! — کہ در دینش ملوکیت حرام است

بالفاظ دیگر

خلافت بر مقام ما گواہی است — حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است
ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ! — خلافت حفظِ ناموسِ الٰہی است

خلافت سے مراد ہے کتاب اللہ کی حکمرانی۔

ان تصریحات قرآنیہ کی روشنی میں یہ بات باعثِ صد حیرت ہوگی، کہ مسلمانوں میں ملوکیت قائم کیسے ہوگئی؟ لیکن اس میں حیرت کی کون سی بات ہے؟ مذہبی پیشوائیت (قرآن کے الفاظ میں احبار و رہبان۔ یعنی علماء و مشائخ) ہر ناجائز کو جائز اور ہر حرام کو حلال کر سکتی ہے

ملوکیت کی شان میں قصائد

قرآن نے انہیں اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۹/۳۱) کہا ہے یعنی خدا کے بالمقابل دوسرے خدا۔ سلاطین نے ملوکیت قائم کی

اور یہ حضرات تبریک و تہنیت کے قصیدوں کے ساتھ آگے بڑھے اور اعلان کیا کہ السلطان ظل اللہ علی الارض۔ بادشاہ: زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے۔ محراب و منبر سے ان کے حق میں ایدہ اللہ بنصرہ اور خلد اللہ ملکہ کی دعائیں مانگی جانے لگیں۔ اس قسم کے فتوے جاری ہونے لگے کہ سربراہ مملکت قتل کے سوا جو جرم بھی کرے تو اس کی کوئی سزا نہیں (فقہ حنفی کی قابل اعتماد کتاب ہدایہ اولین۔ مجیدی ۴۹۳)

امام ابوبکر جصاصؒ (حنفی) اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ معتزلین کے ایک گروہ کا عقیدہ تھا کہ بادشاہ وقت سے ظلم و جور اور بے گناہ لوگوں کے قتل وغیرہ جرائم کا ارتکاب ہو تو اس کے خلاف آواز بلند کرنا بھی جائز نہیں (احکام القرآن۔ جلد ۲۔ صـ ۴۳) حتیٰ کہ یافعی نے اپنی تاریخ میں یزید بن عبدالملک کے زمانے کا واقعہ نقل کیا ہے کہ "چالیس شیوخ نے آکر اس امر کی گواہی دی کہ سلاطین قیامت کے دن بغیر حساب بخشے جائیں گے (تاریخ الیافعی صـ ۲۳۴)

ظاہر ہے کہ جب ہمارے علماء و فقہاء ملوکیت کے حق میں اس حد تک چلے گئے تو ان کے لئے الربا کی حلت (حلال ہونے) کی شکلیں پیدا کرنا کونسا مشکل کام تھا۔ ایک حدیث وضع کی اور اس کے مطابق فقہی قانون مرتب کر دیا۔ وہ حدیث "سنت" بن گئی اور وہ قانون "حکم شریعت" اس کی ایک بین مثال ملاحظہ فرمائیے۔ نظام سرمایہ داری (الربا) کا دارومدار دولت جمع کرنے پر ہے۔ قرآن کریم میں بکثرت مقامات پر دولت جمع کرنے کی سخت وعید آئی ہے سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۳۴ کے حصہ اول میں ہے۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَیَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ... (۹/۳۴)

اے جماعت مومنین (اسے بگوش ہوش سن لو کہ) علماء و مشائخ (مذہبی پیشواؤں) میں سے جنہیں لوگ خدائی درجہ دے دیتے ہیں، اکثر کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ مکر و فریب سے لوگوں کا مال کھا جاتے ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو خدا کے راستے کیطرف دعوت دیتے ہیں لیکن درحقیقت ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگ اس راستے کیطرف آنے نہ پائیں یہ اس راہ میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد ہے۔

وَالَّذِیْنَ یَكْنِزُوْنَ ..... مَا كَنَزْتُمْ تَكْنِزُوْنَ (۹/۳۴-۳۵)

اے رسول! تم ان علماء و مشائخ کو اور ان کے ساتھ ان لوگوں کو (جو ان کی خود ساختہ شریعت کی آڑ میں) سونے چاندی (دولت) کے ڈھیر جمع کرتے رہتے ہیں اور اسے نوعِ انسان کی بہبود کے لئے عام نہیں کرتے، الم انگیز عذاب کی خبر سنا دو ان سکوں کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور ان سے ان کی پیشانیاں ان کے پہلو اور پشت داغے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ مال جسے تم نے اپنی مفاد پرستیوں کیلئے

جمع کر رکھا تھا۔ سو جو کچھ تم نے اس طرح جمع کر رکھا تھا اس کا اب مزہ چکھو۔

زکوٰۃ کی روایت

غور کیجئے کہ اس قدر واضح ارشادِ خداوندی کے بعد، دولت جمع کرنے کی ذرا سی گنجائش نکل سکتی ہے؟ لیکن ان حضرات نے ایک روایت وضع کر کے، اس کے لئے پھاٹک کھول دیئے رکھا۔

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جب (مندرجہ بالا) آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں پر اس کا خاص اثر ہوا یعنی انہوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری اس فکر کو دور کر دوں گا۔ پس عمرؓ، رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا نبی اللہؐ! یہ آیت آپ کے صحابہؓ پر گراں گذر رہی ہے (معاذ اللہ) آپ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے اور میراث اس لئے فرض کیا ہے کہ جو لوگ تمہارے بعد رہ جائیں ان کو مال مل جائے۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا یہ بیان سن کر عمرؓ نے جوشِ مسرت سے اللہ اکبر کہا۔

(ابو داؤد۔ بحوالہ مشکوٰۃ جلد اوّل)

مزارعت

آپ غور فرمائیے کہ اس ایک (وضعی) روایت نے کس طرح قرآن کا سارا معاشی نظام الٹ دیا! جب دولت کے انبار در انبار اکٹھے ہونے لگے، تو اس دولت سے زمینوں کے لامحدود رقبے خریدے گئے۔ اور انہیں کاشتکاروں کو کرایہ یا بٹائی پر دیا گیا۔ فقہا نے فرمایا کہ یہ ایسا نہیں مزارعت ہے اور عین مطابق اسلام بشرطیکہ اس میں سے عشر ادا کر دیا جائے۔ سرمایہ، تجارت پیشہ لوگوں کے ساتھ (INVEST) کر کے منافع میں شریک ہونے لگے۔ فقہا نے کہا کہ یہ مضاربت ہے اور بالکل حلال۔

مضاربت

مزارعت ہو یا مضاربت (جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے) ان کے حق میں روایات وضع کر دینا کچھ مشکل نہ تھا۔ احادیث کے سب سے بڑے مستند جامع امام بخاریؒ بڑے دولتمند تھے۔ وہ خود تجارت نہیں کرتے تھے۔ مضاربت پر سرمایہ لگاتے تھے۔ اس کے علاوہ غلاموں کی تجارت سے ان کی پانصد درہم ماہانہ آمدنی تھی (ظاہر ہے کہ وہ مضاربت یا غلامی کے خلاف روایات کو اپنے مجموعہ میں شامل نہیں کر سکتے تھے)۔ جہاں تک نجی قرضوں کا تعلق ہے، ان پر ربوٰ کے جواز کے لئے ایک نکتہ پیدا کیا۔ قرآن کریم میں ہے یَا أَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوا الرِّبٰوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً (۳/۱۲۹) کہا گیا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ سود در سود (سود مرکب) ناجائز ہے۔ سادہ سود (سود مفرد) ناجائز نہیں؟ یعنی سیر بھر لحم خنزیر حرام ہے، پاؤ بھر نہیں! قرآن کریم نے اس آیت میں ایک عظیم اقتصادی نکتہ بیان فرمایا ہے۔ امام راغبؒ نے کہا ہے کہ مُضٰعَفَةً دراصل ضِعْفٌ سے ہے

ضعف سے نہیں۔ اس لئے آیت کے معنی یہ ہیں کہ ربوٰ جسے تم سمجھ رہے ہو کہ اس سے دولت بڑھتی ہے، درحقیقت اس سے دولت کم ہوتی ہے۔ ربوٰ (سرمایہ بہ منافع) سے محنت کی صلاحیتیں کمزور ہوتی جاتی ہیں اس لئے قومی پیداوار میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ لہٰذا، ربوٰ سے قومی معیشت بڑھتی نہیں، درحقیقت کم ہوتی ہے۔ قرآن نے اس آیت میں یہ کہا تھا۔ اور انہوں نے اس سے "سود مفرد" کے جواز کی راہیں نکال لیں۔ اتنا ہی نہیں۔ انہوں نے ایسی تراکیب بتائیں کہ کھلے بندوں سود کھایا بھی جائے اور گناہ بھی نہ ہو۔ کچھ عرصہ ہوا مفتی محمد ابو سعید غلام سرور قادری نے معاشیات "نظام مصطفٰے" کے نام سے ایک کتاب شائع کی تھی۔ اس میں پہلے سود کے خلاف اسلامی احکامات کا ذکر کیا گیا تھا اور اس کے بعد سود کے گناہ سے بچنے کی تراکیب درج تھیں ملاحظہ فرمائیے۔

سود کے گناہ سے بچنے کی تدابیر

پہلی تدبیر ایک شخص کسی کو دس روپے قرض دے کر اس سے دو (۲) روپے زائد لینا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دو روپے سود ہوں گے۔ لیکن اس جرم اور گناہ سے بچنے کی تدبیر یہ ہے کہ قرض دینے والا، قرض لینے والے کی کوئی چیز دس روپے میں نقد خرید لے اور اسے قرض لینے والے کے ہاتھ مدت معینہ کے لئے بارہ روپے میں ادھار بیچ دے۔ اس مدت کے بعد قرض لینے والا، قرض دینے والے کو بارہ روپے ادا کر دے۔ اس فنی حیلہ سے یہ زائد دو روپے حلال و طیب قرار پا جائیں گے۔

دوسری تدبیر قرض دینے والا اپنی کوئی چیز ایک سو دس روپے میں قرض لینے والے کے ہاتھ ادھار بیچ دے۔ قرض لینے والا اس چیز کو کسی اور کے ہاتھ ایک سو روپے میں نقد بیچ دے۔ قرض دینے والا اس چیز کو اس شخص سے سو روپے میں خرید لے۔ اس طرح وہ چیز بھی قرض دینے والے کو واپس مل گئی اور قرض لینے والے کے ذمے ایک سو دس روپے واجب الادا ہو گئے۔

تیسری تدبیر قرض دینے والا قرض لینے والے کے ہاتھ ایک چیز دو سو روپے میں ادھار بیچ دے۔ پھر اسے اس سے ایک سو روپے میں نقد خرید لے۔ قرض لینے والا معینہ مدت کے بعد اس شے کی قیمت کے طور پر اسے دو سو روپے ادا کر دے گا۔ اس طرح اسے ایک سو روپے زائد مل جائیں گے۔ جو بالکل حلال اور طیب ہو گا۔

چوتھی تدبیر قرض دینے والا کوئی چیز ایک مدت معینہ کے لئے بیس روپے میں ادھار بیچ دے۔ قرض لینے والا اسے کسی اور کے پاس پندرہ روپے میں نقد بیچ دے۔ قرض دینے والا اس سے وہ چیز پندرہ روپے میں خرید لے۔ مدت معینہ کے بعد قرض لینے والا اسے بیس روپے واپس ادا کر دے گا۔ قرض دینے والے کو اپنی چیز بھی مل گئی اور پانچ روپے

"رزقِ حلال" کے طور پر زائد بھی۔ اس طرح، رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔ فقہ حنفی منسوب تو امام اعظم" (ابو حنیفہ) کیطرف ہے لیکن وہ درحقیقت ان کے دو رفقاء (یا شاگردوں) کی مرتب کردہ ہے۔ یعنی امام یوسف" اور امام محمد" کی۔ قادری صاحب ان تراکیب کو درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

امام ابو یوسف (علیہ الرحمۃ) ایسے کاروبار کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس سے منافع بھی ہوگا اور ثواب بھی ہوگا۔ ثواب اس لئے ملے گا کہ اسے سود جیسے حرام سے بچنے کے لئے اختیار کیا گیا ہے (بحوالہ فتاویٰ قاضی خان مع عالمگیری۔ جلد دوم صفحہ ۲۷۹۔

اور مصنف کتاب بصد حسرت و یاس تحریر فرماتے ہیں کہ

لیکن افسوس کہ مسلمان دین فطرت کی ایسی تدابیر سے غافل رہ کر ایسی لعنت میں مبتلا ہیں۔

افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو دیکھے نہ تیری آنکھ نے فطرت کے اشارے (اقبال)

یہ حیلہ گری ربوٰا کے قوانین تک ہی محدود نہیں۔ فقہی قوانین کے ہر شعبہ میں کتاب الحیل شامل ہوتی ہے یہ ہے جو کچھ الربوٰا کے ساتھ ہمارے دورِ ملوکیت میں ہوا۔ وہ دور ختم ہو گیا۔ وہ مملکتیں باقی نہ رہیں وہ سلاطین بھی دنیا سے چلے گئے اور ان کے ساتھ وہ حضرات بھی جنہوں نے یہ قوانین (فقہ) وضع کئے تھے۔ لیکن یہ قوانین شریعت کے نام سے ہمارے ہاں (یعنی مسلمانوں میں) مسلسل چلے آ رہے ہیں، ان کے متعلق عقیدہ یہ پیدا کر دیا گیا ہے کہ یہ اسلامی قوانین ہیں۔ ابدی ہیں اور غیر متبدل۔

پاکستان بنا تو وہی حضرات جنہوں نے اس کی شروع سے آخر تک مخالفت کی تھی، اٹھ کر ادھر آ گئے اور آکر مطالبہ شروع کر دیا کہ چونکہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے اس لئے یہاں اسلامی قوانین نافذ ہونے چاہئیں ان سے کہا گیا کہ مسلمانوں میں اتنے فرقے ہیں۔ ایسے (اسلامی) قوانین کسطرح مرتب ہو سکیں گے جو تمام فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی قرار پائیں۔ اس مطالبہ میں مرحوم مودودی صاحب پیش پیش تھے ان کی کوششوں سے ۱۹۵۱ء میں مختلف فرقوں کے (۳۱) نمائندوں پر مشتمل ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں قرار داد پاس ہوئی کہ ملک میں "کتاب و سنت" کے مطابق قوانین مرتب ہونے چاہئیں۔ مودودی صاحب خوب جانتے تھے کہ یہ فارمولا ناممکن العمل ہے لیکن وہ اس پر مسلسل زور دیتے رہے حتیٰ کہ اسے آئین پاکستان میں بھی شامل کرا دیا۔ بیس سال تک قوم کو اس "اسلامی الجھن" میں مبتلا رکھنے کے بعد فرمایا کہ کتاب و سنت کی رُو سے پبلک لاء کا کوئی متفق علیہ ضابطہ نہیں بن سکتا۔ پوچھا گیا کہ اب کیا کیا جائے۔ فرمایا کہ ملک میں فقہ حنفی نافذ کر دی جائے۔ وہ فقہ جسے وہ خود "مجتہدانہ ستر"

کتاب و سنت کے مطابق

قرار دے چکے تھے۔ سابقہ حکومتوں نے تو اس فارمولا کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا ——— شاید اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ جس طرح "سنت" ہر فرقہ کی الگ الگ ہے اسی طرح فقہی قوانین بھی مختلف فرقوں کے مختلف ہیں، نیز یہ کہ جو قوانین ہزار سال پہلے کے حالات کے مطابق مرتب ہوئے تھے، وہ آج کے حالات پر منطبق نہیں ہو سکتے۔ لیکن موجودہ حکومت نے "اسلامائی زیشن" کو اپنا نصب العین قرار دیا اور فقہی قوانین نافذ کرنے شروع کر دیئے۔ حدود آرڈیننس اور زکوٰۃ سے متعلق احکام کا جو حشر ہوا، میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کیونکہ سردست میرا موضوع الربوٰ ہے۔ فقہ حنفی کی رُو سے نظامِ سرمایہ داری عین مطابق اسلام ہے اور یہی نظام ہمارے ہاں رائج ہے۔ اس نظام میں (۱) بے حد و نہایت دولت جمع کرنے کی کوئی ممانعت نہیں۔ اس پر صرف "زکوٰۃ" دے دینی چاہیئے۔ (۲) زمین پر ذاتی ملکیت جائز ہے۔ اس لئے مزارعت عین مطابق اسلام ہے۔ اس پر صرف عشر ادا کر دینا چاہیئے (۳) دوسروں کے کاروبار میں سرمایہ لگا کر منافع میں شرکت، مضاربت ہے جس کی "اسلام" میں اجازت ہے (۴) ذاتی سود کے سلسلہ میں شرعی حیلے موجود ہیں۔ اس طرح ہمارے ہاں پورے کا پورا نظام سرمایہ داری اسلامی قرار پا چکا ہے جس زمانے میں (یعنی آج سے ہزار سال پہلے) فقہی قوانین مرتب ہوئے تھے، بینک (موجودہ شکل میں) وجود میں نہیں آئے تھے۔ اس لئے ان قوانین میں بینکوں کے سود کے متعلق کچھ نہیں ملتا۔ اس بنا پر یہ مسئلہ آج کل زیرِ بحث و عمل نزاع ہے۔ واضح رہے کہ چونکہ ہمارے ہاں اسلام ایران (عجم) کے راستے آیا ہے اس لئے اس کی اصطلاحات بھی (عربی یا قرآن کی جگہ) ایرانی (فارسی) متداول ہیں۔ صلوٰۃ کی جگہ نماز، صوم کی جگہ روزہ، حالانکہ لسانیات کا مبتدی بھی جانتا ہے کہ کسی زبان کی اصطلاحات کا دوسری زبان میں ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا کیا جائے تو ان کا مفہوم کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح الربوٰ کی جگہ بھی سود کے لفظ نے لے رکھی ہے، پھر سود کو "مسلمان کرنے" کے لئے اس کا ترجمہ "منافع" کر لیا جاتا ہے۔ انگریزی زبان میں دو لفظ مستعمل ہیں۔ (INTEREST) اور (USURY) انٹرسٹ عام طور پر سودِ سادہ کے لئے استعمال ہوتا ہے اور (USURY) سودِ مرکب کے لئے

بینکوں کا سود

الربوٰ کا مفہوم کہیں بھی متعین نہیں کیا جاتا۔ (جیسا کہ ابھی ابھی کہا گیا ہے) ہمارے ہاں آج کل یہ سوال زیرِ بحث ہے کہ بینکوں کا سود جائز ہے یا نہیں۔ حکومت نے اس بحث کے نتیجہ کا انتظار کئے بغیر، نہ صرف یہ کہ اسے جائز قرار دے دیا بلکہ اس سے کٹوتی کا نام زکوٰۃ رکھ دیا۔ اس زکوٰۃ میں دینی مدارس کا بھی حصہ رکھ دیا گیا۔ اس سے اسے علماء حضرات کی تائید حاصل ہو گئی۔ لیکن اب ان کے بعض حلقوں سے اس کے خلاف آواز اٹھ رہی ہے۔ (جیسا کہ طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت اپریل ۱۹۸۴ء میں کہا جا چکا ہے) جماعت اہلِ حدیث کے ترجمان ہفت روزہ الاعتصام (بابت ۲ مارچ ۱۹۸۴ء) نے لکھا ہے

بعض لوگ بینک کے نظام کو سود نہیں بلکہ تجارتی منافع پر مبنی قرار دیتے ہیں۔ لیکن ادھر نصف صدی کے اندر اس موضوع پر اس قدر بحث ہو چکی ہے۔ اردو زبان میں بھی اس قدر لٹریچر آ گیا ہے کہ مزید اضافے کی ضرورت نہیں رہ گئی اور علماء حقانی نے دلائل سے ثابت کر دیا ہے کہ یہ سود ہی ہے۔ منافع نہیں اور اب اس پر سارے عالم کے تقریباً تمام اہل حق کا اتفاق ہے۔

(مولانا) محمد تقی عثمانی (جو وفاقی شرعی عدالت کے جج بھی ہیں) اپنے ماہنامہ البلاغ کی اپریل ۱۹۸۴ء کی اشاعت میں رقمطراز ہیں۔

اب سے چند سال پہلے تک عالمی مذاکروں میں جا بجا مسئلہ زیر بحث یہ آیا کرتا تھا کہ بینکوں کا انٹرسٹ ربوٰ کی تعریف میں داخل ہے یا نہیں۔ اور مغرب زدہ حلقوں کا ایک بڑا عنصر ہمیشہ اس بات پر مصر رہتا تھا کہ بینکوں کا سود ربوٰ میں داخل نہیں اس لئے وہ حلال ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اب وہ دور ختم ہو گیا ہے۔ اب یہ بات صرف علماء تک محدود نہیں بلکہ مسلم ممالک کے ماہرین معاشیات و مالیات میں بھی ایک مسلم عالمی حقیقت کے طور پر مان لی گئی ہے کہ بینک انٹرسٹ ربوٰ کی تعریف میں داخل ہے اور قطعی طور پر حرام ہے۔

یہ مضاربت ہی تو ہے

لیکن یہ حقیقت بڑی دلچسپ معلوم ہو گی کہ ان حضرات کو اس کا بھی علم نہیں کہ بینک کا سود (یا منافع) ہوتا کیا ہے؟ لوگ اپنا روپیہ بینک میں جمع کرتے ہیں۔ بینک اس روپے کو کاروباری لوگوں کو قرض دیتا ہے اس قرض پر جو سود وصول ہوتا ہے اس میں سے بینک اپنا کمیشن کاٹ کر باقی سود کھاتہ داروں کو دے دیتا ہے۔ یہ روپیہ جو کھاتے داروں کو ملتا ہے کاروبار پر منافع ہوتا ہے جو انہیں براہ راست ملنے کے بجائے بینک کی وساطت سے ملتا ہے۔ کاروبار پر منافع میں شراکت کو یہ حضرات مضاربت کہتے ہیں اور اسے حلال و طیب قرار دیتے ہیں۔ آپ غور کیجئے کہ مضاربت حلال و طیب اور وہی مضاربت اگر بینک کی معرفت ہو تو قطعی حرام! یوں یہ حضرات حرام و حلال کے فیصلے کرتے ہیں! اسلامی نظریاتی کونسل کے ایک "فاضل رکن" (مولانا) سید ضیاء الدین کاکاخیل کا ایک انٹرویو مجلہ الاعتصام کی اشاعت بابت ۲۰ اپریل ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا جو انہوں نے لندن میں ایک اخبار کے نمائندہ کو دیا تھا۔ اس میں بڑی دلچسپ بات کہی گئی ہے۔ انہوں نے پہلے کہا ہے۔

صدر صاحب نے نظریاتی کونسل کے افتتاحی اجلاس میں کہا تھا کہ میرے نزدیک جس طرح نماز فرض ہے اسی طرح اس میں کوئی شک نہیں کہ سود قطعی حرام ہے میں چاہتا ہوں کہ آپ ایسا طریقہ وضع کریں کہ بینکاری نظام بھی رہے مگر سود بالکل

ختم ہو جائے۔

"بینکاری نظام بھی رہے اور سود بالکل ختم ہو جائے"؟

اس کے بعد مولانا (کاکاخیل صاحب) نے فرمایا کہ نظریاتی کونسل نے ایک رپورٹ مرتب کی جس میں کہا کہ

جو طریقہ وضع کیا گیا ہے اسے ہم عبوری دور کے لئے گوارا کرتے ہیں۔

جب شراکت اور مضاربت کا نظام کامیاب ہو جائے تو اسے ختم کر دیا جائے۔

یعنی جب شراکت اور مضاربت کا نظام کامیاب ہو جائے تو سودی طریق کو ختم کر دیا جائے۔ اس پر ہمیں وہ پرانا لطیفہ یاد آگیا (جسے بصد معذرت پیش کیا جاتا ہے) کسی گاؤں کے کنوئیں میں کتا گر گیا۔ مولوی صاحب سے مسئلہ پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ پچاس ڈول پانی نکال دو کنواں پاک ہو جائے گا۔ انہوں نے پچاس ڈول پانی نکال دیا لیکن پانی میں بو بدستور رہی۔ گاؤں والوں نے کسی ڈاکٹر سے پوچھا کہ اس کا کیا کیا جائے اس نے کیفیت سنتے ہی کہا کہ تم نے پچاس ڈول پانی تو نکال دیا لیکن کنوئیں سے کتا بھی نکالا تھا یا نہیں! انہوں نے کہا کہ مولوی صاحب نے پانی نکالنے کو کہا تھا۔ کتا نکالنے کو نہیں کہا تھا۔ اس لئے ہم نے کتا نہیں نکالا۔

ایک لطیفہ

یہ حضرات مزارعت، مضاربت، مشارکت کو تو بدستور قائم رکھنا چاہتے ہیں (بلکہ اسے کامیاب بنانے کی فکر کرتے ہیں) اور معاشرہ کو "سود" سے پاک کرنے کی تدابیر سوچتے ہیں۔

وفاقی شرعی عدالت کے چیف جج شیخ آفتاب حسین صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

میرے خیال میں ہر قسم کا سود ربٰوٰ میں شامل ہے۔ اس ضمن میں سفارشات حکومت کو ارسال کی جا چکی ہیں جو صدر مملکت کے زیر غور ہیں۔ سعودی عرب کے فرمانروا کے مشیر ڈاکٹر معروف دوالیبی، پیداواری سود کو ربٰوٰ میں شامل نہیں کرتے۔ سود کی جو قسم بین الاقوامی نوعیت کی ہے دنیا بھر کی اقتصادیات سے منسلک ہے۔ اس میں کوئی ملک تنہا فیصلہ نہیں کر سکتا تاہم داخلی طور پر ہم سود کو ختم کر سکتے ہیں۔

(جنگ۔ لاہور ۲۲۔ اپریل ۱۹۸۴ء)

(مولانا) کاکاخیل نے اپنے انٹرویو میں یہ بھی کہا ہے کہ:۔

وہ رپورٹ جو حکومت کو پیش کی گئی ہے تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل تھی مگر وزیر خزانہ غلام اسحٰق خان صاحب نے کہا۔ ٹھیک ہے۔ آپ فی الحال اسے رہنے دیں۔ ہم نے ان سے کہا کہ ہم سے غلطی ہو سکتی ہے۔ اس لئے اسے شائع کر دیا جائے تاکہ علماء کی رائے بھی ہو جائے۔ مگر وہ نہ مانے اب غلام اسحٰق خان صاحب جو بلا سود کے

نام سے بینک چلا رہے ہیں۔ وہ بھی سراسر سود ہے۔ ہم نے بارہا انہیں لکھا اور کہا مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔

(الاعتصام - ۲۰ اپریل)

غالب نے کہا تھا کہ

ہے دلِ شوریدۂ غالب طلسم پیچ و تاب — رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

عجیب کشمکش ہمارے مولانا حضرات اور مسٹروں کی یہی حالت ہے۔ ان کی جان عجیب ضیق میں آئی ہوئی ہے۔ یہ، ہزار برس پہلے کے انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو اسلام کی غیر متبدل، ابدی حقیقتیں سمجھے ہوئے ہیں۔ وہ نہ صرف یہ کہ قرآن کے خلاف ہیں بلکہ دورِ حاضر کے تقاضوں کو بھی پورا نہیں کر سکتے۔ یہ انہیں چھوڑ نہیں سکتے۔ مولانا حضرات عقیدۃً اور مسٹر حضرات مصلحتاً۔ کہ اس سے دعویٰ نظام اسلامی پر حرف آتا ہے۔ چاہتے یہ ہیں کہ کسی قسم کی پیوند کاری سے، حرام کو حلال قرار دے دیا جائے۔ "کچا ادو مربہ" کی اس روش سے انسان جس جہنم کے عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَةِ (۱۰۴/۶-۷) "یہ خدا کے قانون مکافات کی بھڑکائی ہوئی آگ جس کے شعلے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔"

کفر کا بھی ایک نظام ہے اور اسلام (قرآن) کا بھی ایک نظام۔ ان دونوں میں شرکت یا مفاہمت تو ایک طرف، کسی قسم کی پیوند کاری بھی نہیں ہو سکتی۔ اسلام کے نام اور کفر کے نظام کو ساتھ ساتھ رکھنے والوں کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ ان کا مقام فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (۴/۱۴۵) ہے "جہنم کا پست ترین گڑھا" اور اس سے نکلنے کی صورت صرف اعتصام بحبل اللہ ہے۔ یعنی قرآن خالص کا اتباع۔ زمانۂ نزول قرآن میں، نظام سرمایہ داری، منظم شکل میں موجود نہیں تھا اس لئے اسکے لئے قرآن کریم میں کوئی خاص اصطلاح نہیں آئی۔ جن عناصر ترکیبی سے یہ نظام عبارت ہے وہ وہاں موجود تھے۔ قرآن نے انہیں الربوٰا کہہ کر پکارا ہے اور حرام قرار دیا۔ آج کی اصطلاح میں یوں کہا جائے گا کہ نظام سرمایہ داری کا قرآنی نام الربوٰا ہے۔ دولت کا اکتناز، ذاتی قرضوں پہ سود، مزارعت، مضاربت، بینک کا انٹرسٹ وغیرہ سب اسی نظام کے مختلف عناصر ہیں۔ لہٰذا نظام سرمایہ داری (یعنی الربوٰا) اور اسلام ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ نظام سرمایہ داری کی جگہ، قرآن کا معاشی نظام قائم کر دیا جائے، تو الربوٰا کا خود بخود خاتمہ ہو جائے گا۔ نظام سرمایہ داری باقی رکھنے سے "سود" کے مسئلہ کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ سیکولر نظام میں نظام سرمایہ داری بھی باقی رہتا ہے اور "مذہب" بھی۔ جیسے بھارت کے سیکولر نظام میں ہندوؤں کا دھرم (اور بقول مولانا حضرات)

مسلمانوں کا مذہب محفوظ ہے۔ اسلام (یعنی دین کے نظام) میں ان میں سے کوئی چیز بھی باقی نہیں رہتی۔ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ... (۱۷/۸۱) حق کے آنے پر باطل کافور ہو جاتا ہے جیسے روشنی کی ایک کرن سے تاریکی ختم ہو جاتی ہے۔ روشنی نہ ہو تو تاریکی کی ذرہ برابر بھی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ کفر اور اسلام، مذہب اور دین، نظام سرمایہ داری (انتھیو) اور قرآنی نظام کی یہی کیفیت ہے۔ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً (۲/۲۰۸) ارشاد باری تعالیٰ ہے یعنی اسلام میں پورے کے پورے داخل ہونا ہے۔ اس کے برعکس اگر تم یہ روش اختیار کرو گے کہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ۔ ضابطہ خداوندی کے ایک حصہ پر ایمان لے آئے اور دوسرے حصے سے انکار کر دیا۔ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ (۲/۸۵) تم میں سے جو بھی ایسا کرے گا اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ وہ دنیاوی زندگی میں بھی ذلیل و خوار ہوگا اور قیامت میں شدید ترین عذاب میں مبتلا۔

دنیاوی زندگی میں ہماری حالت ظاہر ہے۔ قیامت کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اس پر ہمارا ایمان ہے۔

تبویب القرآن

(تازہ ایڈیشن)

طلوعِ اسلام بابت اپریل ۱۹۸۴ء میں اعلان کیا گیا تھا کہ پرویز صاحب کی گراں قدر تالیف "تبویب القرآن" کے تازہ ایڈیشن کی پہلی دو جلدیں چھپ گئی ہیں اور تیسری جلد زیر طبع ہے۔ ہمیں امید ہے کہ مکمل کتاب وسط جون تک شائع ہو جائیگی اور موصول شدہ فرمائشوں کی ترتیب کے لحاظ سے روانہ کی جائے گی۔ مکمل سیٹ کی قیمت:- ۲۵۰/- روپے علاوہ محصول ڈاک و پیکنگ

بیادِ اقبالؒ

چار مرگ

(پرویز)

میں نے داستانِ بنی اسرائیل سے متعلق اپنی کتاب برقِ طور میں لکھا تھا:

یوں تو قصص قرآنی کا ہر ٹکڑا عبرت و موعظمت کی ہزار داستانیں اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے اور جوں جوں نگہ دوررس غور و تدبر سے ان کی گہرائیوں تک پہنچتی ہے، ان کے حقائق و رموز زمانہ کی پیچ در پیچ لہروں کی طرح خود بخود کھلتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن ان قصص میں داستانِ بنی اسرائیل کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ اس میں قوموں کے عروج و زوال کے اصول و مبادی اس جامعیت سے سمٹا کر رکھ دیئے گئے ہیں کہ وہ بصائر و حکم کی ایک مستقل دنیا بن گئی ہے۔ فسادِ آدمیت کی تاریخ پر نگاہ ڈالیئے، تین گوشے نمایاں طور پر ابھرے ہوئے نظر آئیں گے۔ استبدادِ حکومت کی سرکش طغیانیاں، برہمنیت کی خواب آور و فسوں ساز فریب کاریاں اور سرمایہ کاری کی بے سکون خون آشامیاں۔ ان میں سے ہر ایک فتنہ بجائے خویش انسانیت کا گلا گھونٹ دینے کے لئے کافی ہے۔ لیکن ذرا سوچئے کہ جس دور میں بیک وقت سطحِ ارض پر بہیمیت و بربریت کے ایسے ہولناک عفریت فضا میں تباہی و بربادی کے ایسے ہلاکت انگیز جراثیم اور دریائے سکون افزا روانیوں کے نیچے ایسے خوفناک نہنگ اژدر موجود ہوں، وہاں خدا کی مخلوق پر کیا قیامت نہ گذری ہوگی؟ تاریخِ مصر کا یہی دور تھا جس کا تذکرہ قرآن کریم میں اس شرح و بسط سے آیا ہے۔ فرعون، استبدادِ ملوکیت کا مجسمہ، ہامان، برہمنیت کی ابلیسانہ روباہ بازیوں کا پیکر، اور قارون، سرمایہ داری کی لعنت کا سب سے بڑا نمائندہ۔ تینوں یکجا۔ اور ان کے آہنی پنجے میں (بنی اسرائیل کی شکل میں) تڑپتی، پھڑکتی بلبلاتی انسانیت۔ حضرات انبیاء کرامؑ کی بعثت کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کے جور و استبداد سے چھڑا کر براہِ راست اللہ کے قانون کی اطاعت میں لے آئیں۔

انسانیت کی پوری تاریخ پر غور کیجئے جس زمانہ میں جس قوم میں اور جس ملک میں فساد دکھائی دے، تحقیق کے بعد معلوم ہو جائے گا کہ اس فساد انگیزی میں انہی تین عناصر کا ہاتھ

کارفرما تھا۔ ملوکیت، سرمایہ داری اور ملائیت (PRIEST HOOD) ملوکیت سے مراد زمانۂ قدیم کی شاہنشاہیت ہی نہیں، اس کا مطلب انسانوں کی حکومت ہے خواہ وہ زمانۂ قدیم کی شاہنشاہیت ہو، خواہ دورِ حاضر کی آمریت (ڈکٹیٹرشپ) حتیٰ کہ مغربی جمہوریت بھی اسی میں شامل ہے کیونکہ وہ بھی بالآخر انسانوں کی انسانوں پر حکومت ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے کسی انسان کو حقِ حکومت حاصل ہی نہیں۔ اور ملوکیت، سرمایہ داری اور برہمنیت (ملائیت) تینوں انسانوں کی حکومت ہی کے مظاہر ہیں۔ زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ یہ ابالیس اپنے پیکر بدلتے رہیں گے۔ لیکن روح ہر جگہ اور ہمیشہ وہی رہے گی۔ اگر قرآن پر بہ نگاہِ تعمق غور کیا جائے تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ حضراتِ انبیاء کرامؑ کی دعوت انہی فساد انگیز عناصر کے خلاف، دعوتِ انقلاب ہوتی تھی۔ وہ لوگوں کو قانونِ خداوندی کے مرکز پر جمع کرتے تاکہ ملوکیت، سرمایہ داری اور ملائیت کے تختوں کو الٹا دیا جائے۔ وہ اس انقلابی کوشش میں ہوتے اور ان کے خلاف یہی قوتیں سر جوڑ کر اٹھ کھڑی ہوتیں تاکہ مظلوم انسانیت ان کے پنجۂ استبداد سے نکلنے نہ پائے۔ امم سابقہ کی داستانیں جو قرآن میں مذکور ہیں اسی کشمکش کی سرگذشت ہیں۔ قرآن خدا کا آخری ضابطۂ حیات تھا اور نبی اکرمؐ خدا کے آخری پیغمبر۔ اس لئے قرآن کریم کے ذریعہ، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں اس کشمکش کو اس کے آخری مراحل تک پہنچا دیا گیا ملوکیت سرمایہ داری اور ملائیت کی ایک ایک قوت کو پاش پاش کر دیا گیا اور انسانیت کو اس سچی آزادی اور صحیح حریت سے آشنا کرا دیا گیا جو ضابطۂ خداوندی کا منشاء و مقصود تھا۔

یہی تھے وہ سلاسل و اغلال جنہیں توڑنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے۔ (وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ) حضورؐ کی بعثت کا مطلب بتایا گیا ہے۔ یعنی آپؐ ہر اس زنجیر کو توڑ دیں گے جن میں انسانیت جکڑے ہوئے چلی آرہی تھی، ہر اس بوجھ کو اتار پھینکیں گے جن کے نیچے انسان دبا ہوا سسک رہا تھا۔ آپ نے ان تمام زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا۔

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست نقش ہائے کاہن و پاپا شکست

جب دنیا میں قرآن کا نظام قائم ہوا تو (زمانہ قدیم کے) صوفی و ملا کی بساط لپٹ گئی (اور اس کے ساتھ ہی ملوکیت اور سرمایہ داری کی بھی)۔

لیکن یہ دور بہت تھوڑے عرصہ تک قائم رہا۔ اس کے بعد خود مسلمانوں نے ان زنجیروں کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو اپنی مشرکانہ عقیدت سے ایک ایک کر کے چُنا اور اس طرح اپنے گلے میں ڈال لیا کہ پھر کوئی طاقت انہیں توڑ نہ سکے۔ آسمان کی آنکھ اس تماشہ کو دیکھ کر رو رہی تھی کہ اس قوم کو کیا ہو گیا کہ:

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

خود قیصر و کسریٰ کے تخت الٹے اور اس کے بعد خود ہی ملوکیت کے تخت بچھا کر ان پر جم کر بیٹھ گئے۔

جب ہم اپنی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو فرطِ حیرت سے انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں کہ مسلمان اس ننگِ انسانیت زندگی کا اس درجہ خوگر ہو گیا کہ اسے قفس کو چھوڑ کر آشیانہ کی زندگی موت نظر آنے لگی۔ مؤرخین اس حیرت انگیز انقلاب کے اسباب و علل تلاش کرتے ہیں۔ لیکن اس کے اسباب تو بالکل نمایاں ہیں۔ مفاد پرست گروہ نے اقتدار کی کرسیوں اور رزق کے سرچشموں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ملائیت نے ابلیسانہ نظام کو عینِ اسلام بنانے کے لئے سندات مہیا کر دیں۔ وہ ان کے وظیفے مقرر کر دیتے تھے اور یہ منبروں پر کھڑے ہو کر اپنے خطبات میں انہیں ظل اللہ قرار دے کر ان کی سلامتی کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ یہ وہی فرعون و قارون و ہامان کی ملی بھگت تھی جس کا ذکر شروع کے اقتباس میں کیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ کے ایسے بندے بھی پیدا ہوتے رہے ہوں جنہوں نے اس کے خلاف آواز بلند کی ہو۔ لیکن جیسا کہ ہر استبدادی قوت کیا کرتی ہے، ان کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ ان کی آواز کو دبا دیا گیا اور ان کے آثار تک کو مٹا دیا گیا۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ آج ہمارے ہاں ملوکیت اور ملائیت کی تاریخ تو پورے طمطراق کے ساتھ موجود ہے۔ لیکن اس کے خلاف آواز اٹھانے والوں کا ذکر تک کہیں نہیں ملتا۔ بجز اس کے کہ کہیں اِدھر اُدھر، یہاں وہاں، کوئی بکھری ہوئی پنکھڑی، مسلی ہوئی مل جائے۔ اس سارے طوفانِ بلا میں اگر کوئی امید کا سہارا تھا تو یہ کہ خدا کی کتاب غلافوں میں لپٹی ہوئی ہی سہی، محفوظ چلی آ رہی تھی۔

یہی تھی خدا کی وہ کتاب جس پر ہمارے دور کے ایک مردِ مومن (علامہ اقبالؒ) نے اپنے نالۂ سحری اور گریۂ نیم شبی کے ساتھ غور و فکر کیا۔ تاریخِ عالم کے اوراق، قوموں کے عروج و زوال کے اسباب اور عصرِ حاضر کے علوم و فنون تک اسے پوری پوری دسترس تھی۔ وہ اس سرمایہ کو لے کر قرآن کی گہرائیوں میں اترا اور وہاں سے اس حقیقت کو پا کر باہر آیا کہ مسلمان کی یہ حالت کیوں ہو گئی۔ یہ وہی حقیقت تھی جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اس نے کھلے کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ مسلمان کی یہ حالت اس لئے ہوئی کہ؎

چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر ۔۔۔ سُود خوار و والی و مُلّا و پیر

اس متاعِ جاں کے پیچھے چار موتیں مسلسل لگی رہیں۔ یعنی سرمایہ داری، ملوکیت، تصوّف اور مذہبی پیشوائیت۔

اس نے مسلمان سے برملا کہہ دیا کہ

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری ۔۔۔ اے کشتۂ سلطانی و ملّائی و پیری

اس نے اپنی تمام عمر، فسادِ آدمیت کے ان گوشوں کے خلاف جہاد میں بسر کر دی۔ اور اسی غم میں سسکیاں لیتے ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو یہاں سے چل دیا اور اب عالمگیر کی مسجد کے زیر سایۂ دیوار آسودۂ خواب ہے۔

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

اُس نے مسلمان کو بتایا کہ ملوکیت کا فتنہ کس قدر غارت گرِ دین و دانش ہے اور اس کے تحت کس طرح انسانی سیرتیں مسخ ہو جاتی ہیں۔ اس نے کہا کہ۔

از ملوکیت نگہ گردد دِگر عقل و ہوش و رسم و رہ گردد دگر

استبداد ملوکیت اس قدر انسانیت کش ہوتا ہے کہ اس سے نگاہوں کے زاویے بدل جاتے ہیں، عقل و ہوش کے تقاضے اور راہ و رسم کے مطالبے کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں۔

اس نے کہا کہ جس جگہ ملوکیت ہو، وہاں حق کا جھنڈا کبھی بلند نہیں ہو سکتا۔ اس لئے مسلمانوں کو کبھی اپنے آپ کو اس فریب میں نہیں رکھنا چاہیئے کہ ہماری سلطنتیں اسلام کی سلطنتیں تھیں اور ان کا نظام قرآن کا نظام تھا۔ اس نے کہا کہ۔

رایتِ حق از ملوک آمد نگوں قریہ ہا از دخلِ شاں خوار و زبوں

انسانوں کی حکومت میں حق کا جھنڈا سرنگوں ہو جاتا ہے۔ بستیاں اجڑ جاتی ہیں۔ اربابِ عزت و توقیر خوار و زبوں ہو جاتے ہیں۔

ارمغانِ حجاز میں اقبالؔ نے خلافت اور ملوکیت کے فرق کو ایک قطعہ میں اپنے دلکش انداز میں واضح کر دیا ہے جہاں کہا ہے کہ۔

خلافت بر مقامِ ما گواہی است حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است
ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ خلافت حفظِ ناموسِ الٰہی است

امتِ مسلمہ کا صحیح مقام حکومت خداوندی ہے۔ انسانوں کی ہر قسم کی حکومت اس کے نزدیک حرام ہے۔ انسانوں کی حکومت خواہ اس کی شکل کچھ ہی ہو، مکر و فریب کا جال اور شعبدہ بازی کا سراب ہوتی ہے۔ ناموسِ الٰہی کی حفاظت صرف قرآنی حکومت میں ممکن ہے۔

اس سے متصل دوسرا قطعہ ہے۔

ہنوز اندر جہاں آدم غلام است نظامش خام و کارش ناتمام است
غلامِ فقرِ آں گیتی پناہم کہ در دینش ملوکیت حرام است

انسان نے اپنے آپ کو خود فریبی میں مبتلا کر رکھا ہے جو سمجھتا ہے کہ میں نے آزادی

حاصل کر لی ہے۔ وہ " بایں ہمہ ادعائے آزادی " ہنوز غلام کا غلام ہے کیونکہ ہر جگہ انسانوں کی حکومت قائم ہے خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ دیا گیا ہو۔ حقیقی آزادی اس پیامبرِ حریتِ انسانیت کے نظام میں حاصل ہو سکتی ہے جس کے دین میں ہر قسم کی انسانوں کی حکومت حرام ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اس سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجاتی ہے کہ ملوکیت کے معنی یہی نہیں کہ باپ کے بعد بیٹا وارثِ تخت و تاج ہو جاتا ہے۔ قرآن کے نزدیک ملوکیت ہر اس نظام کا نام ہے جس میں غیر قرآنی قوانین رائج ہوں۔ خواہ اس کی شکل پادشاہی کی ہو یا جمہوریت کی۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ:

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اس مقام پر ایک مغالطہ کا ازالہ ضروری ہے۔ ہمارا مذہب پرست طبقہ، علامہ اقبالؒ کے اس شعر سے یہ سند پیش کر دیتا ہے کہ مذہب کو سیاست سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اگر خود فریبی نہیں تو مغالطہ آفرینی ضرور ہے۔ اقبالؒ نے دین کہا ہے، مذہب نہیں کہا۔ مذہب، خود دین کی ضد ہے۔ وہ اگر سیاست کے ساتھ مل جائے تو اس سے شدید تر چنگیزیت تصور میں نہیں آسکتی۔ اس میں عوام دوہری غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہتے ہیں۔ اقبالؒ نے جو کہا ہے کہ "جدا ہو دیں سیاست سے" تو اس سے مراد یہ ہے کہ اگر نظامِ حکومت، قرآن کی بنیادوں پر قائم نہ ہو تو اس کا نتیجہ استبداد اور استحصال ہوتا ہے۔

جہاں تک زمانہ قدیم کی بادشاہت کا تعلق ہے دنیا نے، زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر (جو کہ درحقیقت خدا کے کائناتی قانون کے تقاضے ہیں) اسے تو تسلیم کر لیا ہے کہ باپ کے بعد بیٹا وارثِ تخت و تاج نہیں ہو سکتا۔ لیکن چونکہ ان کے پاس خدا کا ضابطۂ قوانین نہیں اس لئے ان کی حالت اب بھی یہ ہے کہ:

زیست از یک بند تا افتاد در بندِ دگر

ایک زنجیر سے چھٹکارا حاصل ہوتا ہے تو وہ دوسری زنجیر میں پھنس جاتا ہے۔

وہ اب یہ سمجھتے ہیں کہ انسانوں کی ایک جماعت (اکثریت) کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ جس قسم کے قوانین چاہے مرتب کر لے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ برسرِ اقتدار طبقہ اس قسم کے قوانین وضع کرتا رہتا ہے جن سے دولت کے سرچشمے ان کے ہاتھ میں رہتے ہیں، اور وہ اس سرمایہ داری سے

ھ مسلمانوں کی بعض مملکتوں میں اب تک یہ نظام رائج ہے۔

وہ کچھ کرتے ہیں جو شخصی حکومت میں بادشاہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے برعکس، قرآن جہاں ملوکیت کو ختم کرتا ہے وہاں سرمایہ داری کو بھی فنا کر دیتا ہے۔ بقول اقبالؒ

چیست قرآں خواجہ را پیغامِ مرگ　　دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ
ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو　　لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا

قرآن کیا ہے؟ ہر قسم کے اربابِ اقتدار کے لئے موت کا پیغام؛ اور بے یار و مددگار، مفلس و ناتواں انسانوں کا دستگیر۔ سرمایہ دار کے ہاتھوں کوئی نیک کام سرانجام پا ہی نہیں سکتا۔ قرآن کا یہ ارشاد اس پہ گواہ ہے کہ "کسی نیکی تک تمہاری دسترس نہیں ہو سکتی جب تک تم حاجت مند انسانوں کے لئے اس مال و دولت کو کھلا نہ رکھو جسے تم اس قدر محبوب رکھتے ہو۔"

اقبالؒ واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ سرمایہ داری، زمینداری اور جاگیرداری درحقیقت آئین و دستورِ ملوکیت ہی کی شاخیں ہیں اور شجرۃ الزقوم کی ان شاخوں کا وہی پھل ہے جو خود ملوکیت کا۔ یعنی...

حاصلِ آئین و دستورِ ملوک　　دہ خدایاں فربہ و دہقاں چو دوک

انسانوں کی حکومت کا ماحصل کیا ہوتا ہے؟ یعنی یہ کہ زمیندار موٹا ہوتا چلا جاتا ہے اور کاشتکار بیچارہ سوکھ کر کانٹا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن جہاں جمع کردہ دولت کو جہنم کا ایندھن قرار دے کر آئینِ سرمایہ داری کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتا ہے، وہاں وہ یہ حکم دے کر کہ وسائلِ پیداوار (ارض) کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں دیئے جا سکتے، زمینداری یا جاگیرداری کے نظامِ کہن پر بھی خطِ تنسیخ کھینچ دیتا ہے۔ یہی ہے وہ حقیقت جس کا اقبالؒ نے بار بار اعلان کیا ہے کہ؎

حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت　　ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت
دہ خدایا نکتۂ از من پذیر　　رزق و گور از وے بگیر، اُو را مگیر!

خدا نے زمین کو نوعِ انسان کے لئے ذریعۂ رزق قرار دیا ہے۔ اور اس ذریعہ کو بلا مزد و معاوضہ عطا کیا ہے۔ یہ جائیداد نہیں۔ (وہ زمین کو ذاتی جائیداد قرار دینے والوں سے کہتے ہیں کہ) اس سے زندگی بھر رزق حاصل کرو اور مرنے کے بعد قبر، اس سے زیادہ اس کا کوئی اور مصرف نہیں۔

قرآن مجید میں ہے الارض للّٰہ۔ (زمین خدا کی ملکیت ہے) مذہب پرست طبقہ کہتا ہے کہ اس طرح تو کائنات کی ہر شے اللہ ہی کی ملکیت ہے۔ اس کا یہ مفہوم نہیں کہ زمین پہ ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ علامہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ قرآن کے اس ارشاد کا ظاہری پہلو یہی ہے کہ اس پہ ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی؎

باطنِ الارض للّٰہ ظاہر است　　ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

وہ زمین پر ذاتی ملکیت کے تصور کو کفر قرار دیتے ہیں۔ قرآن اسے شرک کہتا ہے۔ (۲۹/۲)
ذرا آگے چل کر اسی (جاوید نامہ) میں کہتے ہیں کہ

رزقِ خود را از زمین بُردن رواست　　　این متاعِ بندہ و ملکِ خداست
ارضِ حق را ارضِ خود دانی بگو!　　　چیست شرحِ آیۂ لَا تُفْسِدُوا
ابنِ آدم دل بہ ابلیسی نہاد　　　من ز ابلیسی ندیدم جز فساد

زمین خدا کی ملکیت ہے اور انسانوں کے لئے ذریعہ رزق۔ خدا کی ملکیت کو اپنی ملکیت بنا لینا ابلیسی فساد ہے۔

اس مقام پر انہوں نے پھر اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ خلافت اور سلطنت میں یہی فرق نہیں کہ خلیفہ منتخب ہوتا ہے اور سلطان اپنی سلطنت کو وراثت میں پاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اصل فرق یہ ہے کہ . . .

مجلسِ ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو　　　ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر

لیکن اقبالؒ کی بصیرتِ قرآنی نے اس حقیقت کو بھی بھانپ لیا تھا کہ ملوکیت، سرمایہ داری، زمینداری کی لعنتیں جس قوت کے سہارے پنپتی اور پروان چڑھتی ہیں وہ ملائیت کی بنیادی گمراہی ہے۔ ہر شخص جو ذرا عقل و فکر سے کام لے، بآسانی محسوس کر لیتا ہے کہ ملوکیت سرمایہ داری اور زمینداری یکسر غیر فطری نظام زندگی ہیں۔ لیکن جب مُلّا اسے یہ بتاتا ہے کہ یہ سب کچھ خدا اور رسولؐ کے حکم کے مطابق ہے اور ان سے انکار کرنے والا خدا کا سرکش اور ذاتِ رسالتمآب کا منکر، تو وہ بیچارہ خاموش ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد مُلّا آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ شریعت میں عقل کا کوئی دخل نہیں۔ اگر کسی کے دل میں "خدا اور رسولؐ" کا حکم سننے کے بعد ذرا سا شک و شبہ بھی پیدا ہو جائے تو وہ سیدھا جہنم میں جا گرتا ہے۔ اس پر بیچارہ سادہ لوح مسلمان کانپ اٹھتا ہے اور یہ کہہ کر اپنے آپ کو جھوٹا اطمینان دے لیتا ہے کہ دین کی مصلحتیں خدا اور اس کا رسولؐ ہی جان سکتے ہیں، ہمارا کام ایمان لانا ہے اور بس، حالانکہ جس چیز کو مُلّا خدا اور رسولؐ کے احکام بتا کر پیش کرتا ہے وہ اسی نظام سرمایہ داری کے وضع کردہ قوانین ہوتے ہیں۔ وہ ان سے انکار کرنے والوں پر "اسلام دشمن" کا لیبل لگا کر انہیں گلی کوچے میں بدنام کرتا رہتا ہے کہ یہ ایک "نیا اسلام" لے کر آ گئے ہیں۔ یہ خدا کے احکام کے نافرمانبردار ہیں، یہ رسولؐ کی شانِ رسالت کے منکر ہیں، یہ اسلاف کی بے حرمتی کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ صرف اتنا کہتے ہیں کہ ملوکیت اور سرمایہ داری کے زمانے کے پیدا کردہ احکام، خدا اور رسولؐ کے احکام نہیں ہو سکتے۔ لیکن مُلّا کا تو منصب ہی یہ ہے کہ وہ اپنی احکام کو خدا اور رسولؐ کے احکام بتا کر عوام کو فریب میں رکھے۔ یہ ہے وہ سب سے بڑا سحر جس کے سہارے ملوکیت اور سرمایہ داری کا نظام قائم رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ان "علمبرداران مذہب و شریعت" کی اس شدت سے مخالفت کی ہے۔ اور یہی

وجہ ہے کہ اقبالؒ بھی عمر بھر اسی فتنۂ ملّتِ بیضا کے خلاف جہاد کرتا رہا۔ کہیں اس نے کہا کہ

متاعِ شیخ اساطیرِ کہن بود حدیثِ او ہمہ تخمین و ظن بود
ہنوز اسلامِ او زنار دار است حرم چوں دیر بود او برہمن بود

مذہبی پیشواؤں کا سارا سرمایہ پرانے زمانے کی کہانیاں ہیں۔ ان کی حدیث ظن و تخمین کا مجموعہ ہے۔ اس کا اسلام زمانۂ قبل از اسلام (دورِ جاہلیت) کا اسلام ہے۔

کتنی بڑی حقیقت ہے جسے ان سادہ اور مختصر سے الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ جس چیز کا نام ملّا نے خدا اور رسولؐ کا حکم رکھ چھوڑا ہے وہ درحقیقت اس کا خود ساختہ مذہب ہے جسے اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس کا عجمی اسلام زنار پوش ہے اور یہ اس اسلام کا برہمن۔ اسے کچھ معلوم نہیں کہ حقیقی اسلام کیا ہے۔

بیا ساقی بگرداں ساتگیں را بیفشاں بر دوگیتی آستیں را
حقیقت را بہ رندے فاش کردند کہ ملا کم شناسد رمزِ دیں را

اے ساقی! حقیقی اسلام کا جرعہ عام کر دے۔ اس اسلام کا جس کی حقیقت اس رند (اقبالؒ) پر فاش کی گئی ہے۔ ملّا کو کیا خبر کہ اسلام کسے کہتے ہیں۔

اقبالؒ کہتا ہے کہ قرآن تو اپنے الفاظ میں محفوظ ہے لیکن ملّا اس قرآن کی تفسیر اپنے خود ساختہ تصورات کے مطابق کرتا ہے اور اس طرح قرآن، قرآن نہیں رہتا بلکہ عجمی مجوسیوں کی کتاب بن جاتا ہے۔

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسّر تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پازند

اسی حقیقت کو وہ "ارمغانِ حجاز" میں اس انداز میں بیان کرتا ہے کہ

زمن بر صوفی و ملّا سلامے کہ پیغامِ خدا گفتند ما را
ولے تاویلِ شاں در حیرت انداخت خدا و جبرئیلؑ و مصطفےٰ را

صوفی اور ملّا دونوں کو میری طرف سے سلام کہئے کہ وہ کہتے ہیں کہ وہ خدا کا پیغام ہم تک پہنچاتے ہیں۔ جو کچھ وہ پہنچاتے ہیں اس کے الفاظ تو بے شک خدا کے ہوتے ہیں لیکن اس کی جو تفسیر وہ پیش کرتے ہیں اسے دیکھ کر خدا، جبریلؑ اور رسول اللہؐ ورطۂ حیرت میں گم ہو جاتے ہیں کہ یہ کونسا قرآن ہے جسے یہ پیش کر رہے ہیں۔

یعنی ملّا قرآن کے الفاظ تو وہی دہراتا ہے جنہیں خدا تعالیٰ نے بھیجا، جبریلؑ لایا اور رسول اللہؐ نے لوگوں تک پہنچایا۔ لیکن اس قرآن کا جو مفہوم بتاتا ہے اسے دیکھ کر خدا، جبریلؑ اور محمدؐ تینوں محوِ حیرت رہ جاتے ہیں کہ یہ کونسا قرآن ہے جسے اس طرح بیان کیا جا رہا ہے۔ ملّا کا یہی وہ خود ساختہ مذہب ہے جس نے مسلمانوں جیسی ہمہ تن برق قوم کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا ہے۔ یہی ہے وہ حقیقت جس کے احساس سے اقبالؒ کہتا ہے کہ

مکتب و ملّا سخنہا ساختند | مومناں ایں نکتہ را نشناختند
زندہ قومے بود از تاویلے مُرد | آتشِ او در ضمیرِ اُو فسُرد

اس نے قرآن جیسی زندگی بخش کتاب کو افسانوں کا مجموعہ بنا کر رکھ دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ یکسر زندہ و پائندہ قوم بجھی ہوئی راکھ بن کر رہ گئی ہے۔

بظاہر ملّا کی باتیں سنیئے تو ایسا نظر آئے گا کہ دین کی حفاظت کا درد اُسے کھائے جا رہا ہے۔ لیکن اگر اس کے دل کو ٹٹول کر دیکھئے تو اس میں سوائے مصلحت بینی اور مفاد پرستی کے کچھ نہیں ہوگا۔ خدا، رسولؐ، قرآن، احادیث، اسلاف، مذہب، شریعت، وہ مقدس اور حسین نقاب ہیں جن کی اوٹ میں وہ اپنی مفاد پرستیوں کو آگے بڑھاتا رہتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

دلِ مُلّا گرفتارِ غمے نیست | نگاہے ہست درچشمش نمے نیست
ازاں بگریختم از مکتبِ اُو | کہ در ریگِ حجازش زمزمے نیست

ملّا کے دل میں نہ اسلام کا درد ہے نہ ملّت کا غم۔ اس کی آنکھ کبھی نم آلود نہیں ہوتی۔ اس کے حجاز کے صحرا میں خشک ریت ہی ریت ہے۔ زمزم کا صاف و شیریں چشمہ کہیں نہیں جس سے پیاس بجھ سکے۔ یہ وجہ ہے کہ میں اس کے مکتب سے دامن چھڑا کر بھاگ آیا ہوں۔

اس کی مفاد پرستیوں کا تقاضا ہوتا ہے کہ وہ ملّت کو کبھی ایک نقطہ پہ جمع نہ ہونے دے۔ فرقہ بندی (کہ جسے قرآن نے بہ نصِ صریح شرک قرار دیا ہے) اس کے اسلام کی اصل و بنیاد ہے۔ فرقہ بندی کی نفسیات یہ ہیں کہ اپنے فرقہ کے لوگوں کے دل میں دوسروں کی طرف سے نفرت پیدا کی جائے۔ جس قدر نفرت شدید ہوگی اتنا ہی وہ فرقہ زیادہ مضبوط ہوگا۔ ملّا کی ساری عمر نفرت کے جذبات کو ہوا دینے میں گذر جاتی ہے۔

سرِ منبر کلامش نیش دار است | کہ او را صد کتاب اندر کنار است
حضورِ تو من از خجلت نہ گفتم | ز خود پنہاں و بر ما آشکار است

وہ سرِ منبر وعظ کہتا ہے تو سینکڑوں کتابوں کے حوالے دیئے چلا جاتا ہے۔ لیکن اس کی زبان میں ایسا ڈنک ہوتا ہے کہ وہ کسی کو بخشتا نہیں۔ یا رسول اللہؐ! میں نے شرم کے مارے آپ سے کھُل کر بات نہیں کی کہ یہ (ملّا) ہے کیا؟ یہ دوسروں کے عیب گناتا رہتا ہے لیکن اپنے آپ پر کبھی نگاہ نہیں ڈالتا۔

اسی حقیقت کو اقبالؒ نے جاوید نامہ میں سعید حلیم پاشا کی زبان سے یوں بیان کیا ہے۔

دینِ حق از کافری رسوا تر است | زانکہ مُلّا مومنِ کافر گر است
شبنمِ ما در نگاہِ ما یم است | از نگاہِ اُو یمِ ما شبنم است

اس نے دینِ حق کو کفر سے بھی زیادہ ذلیل و خوار کر دیا ہے کہ کافر تو اپنے کفر کو اپنے

آپ تک ہی محدود رکھتا ہے لیکن یہ "مومن" دوسروں کو کافر بناتا رہتا ہے۔ کفر کے فتوے صادر کرتے رہنا اس کا مشغلہ ہے۔ ہماری نگاہوں میں تو ملت کا ایک ایک قطرہ سمندر جیسا ہے اور اس کی نگاہ میں اس کا سمندر بھی قطرہ سے زیادہ نہیں۔

اس دوسرے شعر پہ غور کیجئے اور دیکھئے کہ کیا ملا کی ساری عمر اسی "جہاد" میں نہیں گذر جاتی کہ وہ اپنے اور اپنے حواریوں کے سوا تمام مسلمانوں کو نہایت حقارت کی نگاہ سے دیکھے، ان کی ہنسی اڑائے، انہیں ذلیل سمجھے اور اپنے آپ کو "صالحین" میں شمار کرے۔ اس کے بعد اقبال پھر اسعید حلیم پاشا کی زبان سے کہتا ہے کہ۔

از شگرفیہائے آں قرآں فروش — دیدہ ام روح الامین را در خروش
زاں سوئے گردوں دلش بیگانۂ — نزد او ام الکتاب افسانۂ

اس "قرآن فروش" کی بوالعجبیوں سے میں نے جبریل امین کو وقفِ اضطراب دیکھا ہے۔ وحی کی دنیا سے اس کا کچھ تعلق نہیں۔ اس کے نزدیک، قرآن افسانہ سے زیادہ کچھ نہیں۔

ملا کی قرآن فروشی کی داستانوں سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ لیکن ماضی میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ آج اپنے سامنے دیکھ لیجئے کہ ملا کس جرأت اور بے باکی سے قرآن بیچ رہا ہے۔ غور کیجئے! خود پاکستان میں کتنے ایسے ملا ہیں جن کا بظاہر کوئی ذریعۂ معاش نہیں لیکن جن کے پاس کوٹھیاں ہیں، موٹریں ہیں، ٹیلیفون ہیں۔ عیش و عشرت کے سامان ہیں۔ ملا کا گروہ دن رات چلاتا نظر آئے گا کہ حکومت کے کارندے بے ایمان ہیں، بددیانت ہیں، رشوت خوار ہیں، ان کی تنخواہیں قلیل ہیں۔ لیکن ان کے پاس جائیدادیں کثیر ہیں۔ لیکن آپ نے آج تک کبھی کسی ملا کو یہ کہتے نہیں سنا ہوگا کہ فلاں مولوی صاحب کو دیکھئے کہ ان کا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں (یا اگر ہے تو بہت قلیل ہے) لیکن وہ جائیدادیں بنوا رہے ہیں، ہزاروں روپے ماہانہ کا خرچ ہو رہا ہے۔ ٹھاٹھ سے زندگی بسر ہو رہی ہے۔ ذرا معلوم کرنا چاہیئے کہ بالآخر یہ روپیہ کہاں سے آرہا ہے۔ ملا کی نگاہ کبھی ان کی طرف نہیں اٹھتی۔ کیوں اٹھے۔ یہ تو صالحین کا گروہ ہے۔ یہ "شہداء علی الناس" کی جماعت ہے۔ ان کا کام دوسروں کے ایمان کی نگرانی ہے۔ اپنے گروہ کے متعلق لب کشائی نہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ حمام میں سب ننگے ہیں۔ یہ ملا کے عمل کی کیفیت ہے اور علم کی یہ حقیقت کہ۔

بے نصیب از حکمتِ دینِ نبیؐ — آسمانش تیرہ از بے کوکبی
کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد — ملت از قال و اقولش فرد فرد

یہ "دین نبویؐ" کی حکمت سے قطعاً بے بہرہ ہے۔ اس کے آسمانِ علم پر کوئی چمکتا ہوا ستارہ نہیں۔ وہاں تاریکی ہی تاریکی ہے۔ یہ ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ بحث و مباحثہ میں

؎۱ یہ ۱۹۵۲ء میں کہا گیا تھا۔ اب معاملہ ہزار گنا آگے بڑھ چکا ہے۔

الجھے رہتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں تفرقہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ایک کے ساتھ دوسرا نہیں ملتا۔

اس کے بعد وہ دو شعر سنیئے جن میں اقبالؒ نے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا ہے جب کہا ہے کہ۔

مکتب و ملّا و اسرارِ کتاب — کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب
دینِ کافر فکر و تدبیرِ جہاد — دینِ ملّا فی سبیل اللہ فساد

مکتب و ملّا، اور قرآن کے رموز و اسرار! ان کی مثال یوں سمجھئے جیسے ایک پیدائشی اندھے کے سامنے سورج کی روشنی۔ دنیا کی غیر مسلم قومیں اپنی ترقی اور استحکام کے لئے مصروفِ جہاد رہتی ہیں اور ملّا خدا واسطے فساد برپا کرنے میں مصروف!

یہ شعر نہیں ایک چیخ ہے جو دل کی گہرائیوں سے اٹھی اور بے ساختہ زبان سے نکل کر آسمان سے جا ٹکرائی ہے۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ اسی عنوان کی تفسیر ہے کہ۔

"دینِ ملّا فی سبیل اللہ فساد"

یہ تھا حقیقت میں ابلیس کا وہ سب سے زیادہ مؤثر حربہ جو اس نے ملّتِ اسلامیہ کے خلاف استعمال کیا۔ اسی حقیقت کو جاوید نامہ میں ابلیس کی زبان سے یوں ادا کیا گیا ہے کہ۔

نے حدیث و نے کتاب آوردہ ام — جانِ شیریں از فقیہاں بردہ ام
رشتۂ دیں چوں فقیہاں کس نہ رشت — کعبہ را کردند آخر خشت خشت

ابلیس کہتا ہے کہ میں نے نہ کوئی نیا دین ایجاد کیا ہے۔ نہ احادیث کا کوئی مجموعہ لایا ہوں۔ نہ کوئی نئی کتاب۔ مجھے اس کی ضرورت ہی نہ تھی میں نے بس اتنا کیا ہے کہ ملّا کے بدن سے جان نکال کر اسے جسدِ بے روح بنا دیا ہے۔ اس سے اس نے خدا کی کتاب کو ورق ورق کر کے بکھیر دیا ہے۔ کعبہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ہے۔

ملّا کے اس مسلک فساد انگیزی، نفرت خیزی اور فتنہ جوئی کو اقبالؒ نے ذرا شوخ انداز میں زبانِ جبریل میں اس طرح بیان کیا ہے۔

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبطِ سخن کر نہ سکا — حق سے جب حضرتِ ملّا کو ملا حکمِ بہشت
عرض کی میں نے الٰہی میری تقصیر معاف — خوش نہ آئیں گے اسے حورِ شراب و لب کشت
نہیں فردوس مقامِ جدل و قال و اقول — بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت

ہے بد آموزیٔ اقوام و میل کام اس کا
اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت

اقبالؒ نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ ملّا کے اس جذام کا اس کے سوا کوئی علاج نہیں کہ عوام کو ملّا کے ہاتھ سے چھڑا لیا جائے۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مسلمانوں کے عوام کے دل

میں بڑا خلوص ہے اور وہ ہر ممکن قربانی کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اس کے الفاظ ہیں :-

بجز دخوبی ہر خواص آمد حرام دیدہ ام صدق وصفا را در عوام

بڑے لوگوں میں مفادِ عامہ کے جذبات مفقود ہیں، میں نے عوام میں خلوص اور صداقت دیکھی ہے

اس لئے یہ بھی محسوس کیا کہ عوام بڑے سادہ لوح ہیں اور ملا انہیں مذہب کے نام پر ابھار کر اپنی مفاد پرستیوں کا آلۂ کار بنا لیتا ہے۔ یہی تھی وہ حقیقت جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا کہ

شیخ شہر از رشتۂ تسبیح صد مومن بدام

ملا اپنی تسبیح کے تاگے سے جال بُنتا ہے اور اس میں عوام کو پھانس لیتا ہے۔

"تسبیح کے تاگوں سے بنا ہوا جال" کیسی برجستہ تشبیہ ہے۔

اس کا علاج اس کے نزدیک اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایک خطۂ زمین حاصل کیا جائے جس میں قرآن کے نظام کو از سرِ نو قائم کیا جائے۔ جونہی وہ نظام قائم ہو گیا، ملوکیت، سرمایہ داری اور ملائیت خود بخود فنا ہو جائے گی کہ

ایں صنم تا سجدہ اش کردی خدا است چوں یکے اندر قیام آئی فنا ست

یہ بت وہ خدا ہیں کہ جب تک تم ان کے سامنے سربسجود رہو ان کی خدائی قائم رہتی ہے، اگر ان کے سامنے کھڑے ہو جاؤ تو یہ ختم ہو جاتے ہیں۔ تو برف کے تودے ہیں جو سورج کے طلوع ہونے پر خود بخود پگھل جاتے ہیں۔

یہ تھا وہ مقصدِ جلیلہ جس کے لئے اس مردِ خدا اندیش نے پاکستان کا تصور دیا۔ یہ خطۂ زمین مل بھی گیا لیکن اس وقت جب اقبالؔ یہاں سے جا چکا تھا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ وہی جذام جسے دُور کرنے کے لئے اس نے اس خطۂ زمین کے لئے دعائیں مانگی تھیں، چاروں طرف سے امنڈ کر اسی خطۂ زمین میں جمع ہو گیا اور آج حالت یہ ہے کہ

زاغوں کے تصرف میں ہے شاہیں کا نشیمن

کتنا حسین تھا وہ خواب اور کس قدر بھیانک ہے اس کی یہ تعبیر، اگر ہمارے یہی کیفیت اور رہی[1] تو کچھ بعید نہیں کہ یہ خواب پھر سے خواب پریشاں بن جائے۔

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے فقیہہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

لیکن جب تک قرآن باقی ہے ہمارے لئے مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔

محفل ما بے مے و بے ساقی است ساز قرآں را نواہا باقی است

زخمۂ ما بے اثر افتد اگر آسماں دارد ہزاراں زخمہ ور

---

[1] اسے فراموش نہ کیجئے کہ یہ الفاظ اپریل ۱۹۵۳ء میں لکھے گئے تھے۔ (طلوع اسلام)

ذکرِ حق از آستاں آمد غنی — از زمان و از مکاں آمد غنی
حق اگر از پیشِ ما بردارد ش — پیشِ قومے دیگرے بگذارد ش

ہماری محفل میں نہ شراب باقی ہے نہ ساقی۔ قرآن کا ساز بھی خاموش ہے، کیونکہ سازندہ کوئی نہیں رہا۔ لیکن اس سے کچھ حرج واقعہ نہیں ہوگا۔ اگر ہمارا مضرابِ ناکارہ ہو گیا ہے، تو کیا؟ سازِ قرآن کے تاروں میں تو نغمے بدستور پوشیدہ ہیں۔ جب بھی کوئی زخمہ ور آیا، یہ نغمے ان تاروں سے ابھر کر باہر آ جائیں گے۔ خدا کی بات، کسی خاص قوم کی محتاج نہیں۔ ہم میں وہ صلاحیت نہیں رہی تو ہماری جگہ کوئی اور قوم آ جائیگی جو اس کے پرچم کو لیکر کھڑی ہو جائے گی۔

اقبالؒ بجنے کو تو یہ کچھ کہہ گیا، لیکن اس سے دل پر جو چوٹ لگی اسے چھپا نہ سکا۔ وہ ایسی تھی ہی نہیں کہ اسے چھپایا جا سکے۔ کہا کہ

ترسم از روزے کہ محرومش کنند — آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند

اس دن سے ڈر لگتا ہے جب ہمیں قرآن کی حراست سے محروم کر دیا جائے گا اور اس آتشِ شوق کو کسی اور سینے کی طرف منتقل کر دیا جائے گا۔

اور یہ ہوگا خود قرآن مجید کے اس اٹل قانون کی رُو سے جس میں کہا گیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ۔ (۵/۵۴)

اے ایمان والو! جو تم میں سے نظامِ خداوندی سے روگردانی اختیار کرے گا تو اس قوم کی جگہ اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو لے آئے گا جو نظامِ خداوندی سے محبت رکھے گی۔ اور وہ نظام اس قوم کو اپنے لئے خوش آئند پائے گا۔ اس قوم کے افراد کی خصوصیات یہ ہوں گی کہ ان لوگوں کے مقابلے میں نہایت نرم اور جھکے ہوئے رہیں گے جو اس نظام کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیں (جو مومن ہوں) لیکن مخالفین کے مقابلے میں بڑے سخت ہوں گے، وہ اس نظامِ خداوندی کے قیام و بقا کے لئے جان تک لڑا دیں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔ یہ وہ فضلِ ایزدی ہے جو ہر اس قوم کو نصیب ہو سکتا ہے جو اسے حاصل کرنا چاہے۔ یاد رکھو! اللہ کا قانون زندگی کی خوشحالیوں اور کشادگیوں کا حامل ہے اور ہر قوم کے اعمال سے باخبر۔ (نشانۂ منزل ۱۹۵۳ء)

یہ ہے اقبالؒ کا وہ پیغام جو نہ ریڈیو پر سنائی دے گا نہ ٹیلی ویژن پر۔ نہ کسی سیمینار

ہیں نہ مذاکرہ ہیں۔ نہ اس کی یہی کے موقعہ پر نہ کسی اور تقریب پر۔ جس طرح ابلاغِ شیبہ؟ قرآن جلسوں میں تلاوت کے لئے رہ گیا ہے یا شبینوں کے لئے، اسی طرح اقبالؒ بھی یا قوالوں کے حھٹکا کرنے کے لئے رہ گیا ہے یا اپنے مفید مطلب پروگراموں کا خلا پورا کرنے کے لئے۔ یہ اس لئے کہ جس طرح چمگادڑ سورج کی روشنی برداشت نہیں کر سکتا اسی طرح زندگی بخش پیغام مردہ قوموں پر سخت گراں گزرتا ہے۔ لیکن وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ (۶۱/۸) سورج طلوع ہو کر رہے گا۔ خواہ چمگادڑ اس سے کتنے ہی کبیدہ خاطر کیوں نہ ہوں۔ اس مشرق سے نہ سہی، کسی اور مشرق سے سہی۔ وہ تو ربّ المشارق ہے۔

رشتے مطلوب ہیں

(۱) نہایت معزز، شریف، خاندان کی سلیقہ شعار دوشیزہ کے لئے جس کی عمر قریب بیس اکیس سال ہے، اور جو تھرڈ ایئر کی طالبہ ہے، موزوں رشتہ درکار ہے۔ نمود و نمائش، فضول رسمیات اور گراں بار مطالبات سے احتراز ضروری ہے

خط و کتابت بصیغہ راز (ف۔ق معرفت ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ II لاہور

(۲) معاشرہ میں باعزت خاندان کی ایک ستائیس سالہ ناکتخدا لڑکی کے لئے برسرِ روزگار موزوں رشتہ مطلوب ہے

خط و کتابت بصیغہ راز۔

(م۔م معرفت ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ II لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روزوں کا مقصد

(پرویز صاحب کا ایک درسِ قرآن)

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ (۲/۱۸۳) "اے جماعتِ مومنین! تم پر صیام فرض قرار دیئے گئے ہیں"۔ یہ "کتاب" یعنی حکم ہے۔ اس کی غایات کے متعلق کہا ہے لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ (۲/۱۸۳) لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ (۲/۱۸۵) اور وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ۔ (۲/۱۸۵)

تَتَّقُوْنَ سے مراد یہ ہے کہ تم میں قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے لئے پختگی پیدا ہو جائے اور تم غلط راہوں پر چلنے کے نقصانات سے محفوظ ہو جاؤ۔ تشکرون، سے مقصود یہ ہے کہ تمہاری ممکنتیں بھرپور نتائج پیدا کر دیں۔ میں ان دو غایات کے متعلق سردست تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ قرآن کریم نے جو غایت الغایات بتائی ہے اس پر مرکوز رہوں گا۔ اور وہ غایۃ الغایات یہ ہے کہ تم خدا کے بتائے ہوئے پروگرام پر عمل کرنے سے اس قابل ہو جاؤ گے کہ دنیا میں خدا کی کبریائی قائم کر سکو۔ یہ ہے روزوں کے متعلق حکمِ خداوندی کا مقصود و منتہیٰ۔ یعنی خدا کی کبریائی قائم کرنے کے قابل ہو جانا۔

لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ

سب سے پہلے لفظ "کبریائی" کو لیجئے۔ اس کے معنی حکومت اور اقتدار کے ہیں۔ سورۂ یونس میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ اور ان کے بھائی حضرت ہارونؑ، فرعون کے پاس گئے اور اس تک خدا کا پیغام پہنچایا تو اہلِ فرعون نے کہا کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو ہم اس کی غرض و غایت کو خوب پہنچانتے ہیں یعنی یہ کہ تَکُوْنَ لَکُمَا الْکِبْرِیَآءُ فِی الْاَرْضِ (۱۰/۷۸) "تمہارا مقصد یہ ہے کہ اس ملک میں حکومت تمہاری قائم ہو جائے۔ اقتدار تمہارے ہاتھ میں آ جائے"۔ اس سے لفظ "کبریائی" کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

جہاں تک خارجی کائنات کا تعلق ہے اس میں خدا کا اقتدار اور اس کی حکمرانی براہِ راست قائم ہے۔ تمام کارگہِ کائنات اسی کے قوانین کے مطابق سرگرمِ عمل ہے اور اس میں کسی شے کو مجالِ انحراف نہیں

یا اسے سرکشی نہیں: وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۴۵/۳۷) "کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں کبریائی خدا کی ہے۔ وہ زبردست غلبہ کا مالک ہے۔ لیکن اس کا غلبہ مستبد حکمرانوں کا غلبہ نہیں۔ وہ سراسر حکمت پر مبنی ہے۔" دوسری جگہ ہے: وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ۔ (۴۳/۸۴) "وہی آسمانوں میں بھی صاحبِ اقتدار ہے اور وہی ارض پر بھی صاحبِ اقتدار۔" (الٰہ کے معنی صاحبِ اقتدار کے ہیں)۔

خارجی کائنات میں تو خدا کا اقتدار از خود قائم ہے۔ لیکن اس کی مشیت کا پروگرام یہ ہے کہ انسانوں کی دنیا میں اس کی کبریائی از خود نہیں بلکہ انسانوں کے ارادوں سے قائم ہو۔ اسی مقصد کے لئے رسول بھیجے جاتے تھے اور رسول کے بعد اس کی ذمہ داری اس کی اُمت پر عائد ہوتی تھی۔ چنانچہ جب نبی اکرمؐ کو منصبِ نبوت پر سرفراز فرمایا گیا تو آپ کو حکم دیا گیا کہ یٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ۔ "اے وہ کہ جس کی آمد سے خزاں دیدہ گلشنِ کائنات بہارِ نو کا مظہر بن جائے گا۔ (المدثر کے یہی معنی ہیں)۔ قُمْ فَاَنْذِرْ۔ "اٹھ اور نوعِ انسان کو ان کے اپنے وضع کردہ نظام ہائے حیات کی تباہ کاریوں سے آگاہ کر دے"۔ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (۷۴/۱-۲)۔ "اور ان نظاموں کی جگہ اس نظام کو قائم کر جس میں کبریائی صرف خدا کے لئے ہو"۔ ——— یہ تھا منصبِ رسالت۔

دوسرے مقام پر اسی حقیقت کو جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ان کی تفصیل بڑی وسعت چاہتی ہے۔ لیکن میں ان میں سے صرف دو ٹکڑوں کو نمایاں طور پر سامنے لاؤں گا۔ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ۔ "حکومت صرف اسی کے لئے مختص ہے۔ اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔" اور اس سے آگے ہے، وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا۔ (۱۷/۱۱۱) "لہٰذا تم اس کی کبریائی قائم کرو۔" اسی اعتبار سے خدا نے اپنے آپ کو ایک جگہ اَلْمُتَكَبِّرُ (۵۹/۲۳) کہا ہے۔ کہیں اَلْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ (۱۳/۹) اور کہیں اَلْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ۔ (۲۲/۶۲) ہماری دنیا میں وہ اَلْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ کیسے قرار پاتا ہے اس کی وضاحت اس نے یہ کہہ کر کر دی کہ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ (۴۰/۱۲) تمہاری دنیا میں حکم صرف اس خدا کا چلنا چاہیئے جو ہر قسم کے غلبہ اور کبریائی کا مالک ہے۔

اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا نہ تو ہمارے سامنے آتا ہے۔ نہ وہ تختِ حکومت پر بیٹھتا ہے۔ نہ ہم اس کی آواز سنتے ہیں۔ تو ہمارے معاشرے میں اس کی حکومت کیسے قائم ہوگی؟ اس کے لئے اس نے خود ہی بتا دیا کہ ——— اس نے ہماری طرف اپنا ضابطہ احکام بھیج دیا ہے۔ جو حکومت اس ضابطہ کے مطابق قائم ہوگی اُسے خدا کی حکومت سے تعبیر کیا جائے گا۔ چنانچہ اس نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے ان ہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

(۰)

لیکن خدا کی یہ کبریائی یونہی بیٹھے بٹھائے، وعظ و نصیحت یا تقاریر و خطابات سے قائم نہیں ہو جاتی۔

جب اس کا مقصد دنیا کے ہر نظام کو اُلٹ کر اُس کی جگہ نظامِ خداوندی کو متمکن کرنا ہے تو ظاہر ہے کہ دنیا کی ہر قوم اور ہر حکومت کی طرف سے اس کی مخالفت ہوگی اور ہر مفاد پرست گروہ اس کی مزاحمت کرے گا۔ ان مخالفتوں اور مزاحمتوں کے مقابلے کے لئے میدانِ جنگ تک میں بھی جانا پڑے گا۔ چنانچہ قرآن کریم میں جماعتِ مومنین کی ان جنگوں کی غایت یہ بتائی گئی ہے:۔

وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا۔ (۹/۴۰)

اس سے مقصد یہ ہے کہ ہر غیر خداوندی نظام مغلوب ہو جائے اور خدا کا نظام جسے غالب ہونے کا حق حاصل ہے، عملاً مسلط ہو جائے۔

اس سے چند ہی آیات پہلے کہا گیا ہے:۔

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ۔ (۹/۳۳)

خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطۂ ہدایت اور حق پر مبنی نظام دے کر بھیجا تاکہ یہ نظام انسانوں کے ہر خود ساختہ نظام پر غالب آجائے۔ خواہ یہ تبدیلی ان لوگوں پر کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرے جو خالص حکومتِ خداوندی قائم نہیں کرنا چاہتے۔

یہاں صرف اتنا کہا گیا ہے کہ اس نے رسول کو اس مقصد کے لئے بھیجا۔ لیکن دیگر مقامات پر اس کی وضاحت کر دی کہ نظامِ خداوندی کا قیام تنہا رسول کے ہاتھوں سے عمل میں نہیں آئے گا۔ اس کے لئے جماعتِ مومنین کی معاونت و رفاقت بھی ضروری ہوگی۔ یعنی یہ فریضہ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ (۴۸/۲۹) کے ہاتھوں سرانجام پائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے اَلاعلیٰ اپنے آپ کو کہا تھا لیکن جس جماعتِ مومنین کے ہاتھوں اس کی کبریائی دنیا میں قائم ہوتی ہے۔ اس نے انہیں اَلْأَعْلَوْنَ کہہ کر پکارا ہے۔ چنانچہ اس نے فرمایا: وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (۳/۱۳۸) "اگر تم مومن ہو اور مومن رہے گے تو دنیا میں تم ہی سب پر غالب رہو گے"۔ تمہارا قائم کردہ نظام انسانوں کے ہر خود ساختہ نظام پر غالب آجائے گا۔ اس غلبہ و تسلط کے لئے قرآن کریم نے إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ کی شرط عائد کر دی ہے۔ "یعنی اگر تم مومن ہو گئے تو"۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ ہم مومن ہیں یا نہیں؟ اس کے لئے قرآن نے خود یہ واضح کر دیا کہ جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ مومن نہیں کافر ہیں۔ لہٰذا مومن وہ ہیں جو خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم کرتے ہیں۔ اور اس کی محسوس نشانی یہ ہے کہ وہ دنیا کی ہر قوم پر غالب رہتے ہیں۔ چنانچہ اس نے واضح طور پر کہہ دیا کہ

وَلَن يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا (۴/۱۴۱)

خدا کبھی ایسا نہیں ہونے دے گا کہ غیر خداوندی نظام کی حامل قوم کو جماعتِ مومنین پر غالب آنے دے۔

لہٰذا یہ متعین کرنا بالکل آسان ہو گیا کہ ہم مؤمن ہیں یا نہیں؟

یہاں ایک عظیم نکتہ سامنے آتا ہے۔ خدا مؤمنین سے کہتا ہے کہ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ۔ لیکن مؤمن اس کی عطا کردہ اس سرفرازی کے جذبۂ تشکر کے احساس سے بے ساختہ اپنا سر زمین پر رکھ دیتا ہے اور انتہائی انکساری اور خاکساری کے عالم میں کہتا ہے کہ اَلْاَعْلٰی میں نہیں۔ سُبْحٰنَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی ـــــ اَلْاَعْلٰی کے شایانِ شان صرف تیری ذات ہے۔ یہ تو تیری عاجز نوازیاں ہیں، جو ہمیں اَلْاَعْلَوْنَ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یہ علو مرتبت ہماری ذاتی نہیں، تیری عطا فرمودہ ہے۔ اگر ہمارا سر تیرے سامنے نہیں جھکتا تو یہ ساری کبریائی جو ہمیں حاصل ہوئی ہے فرعون کی قہر مانیت ہے، مؤمن کی علوشان نہیں۔ اسی بنا پر قرآن کریم نے حق پر مبنی کبریائی اور باطل پر مبنی کبریائی میں فرق کر کے بتا دیا جب کہا:۔

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ۔ (۷/۱۴۶)

جو لوگ الحق کے بغیر زمین میں غلبہ اور کبریائی حاصل کر لیتے ہیں، ہم اپنے قوانین کی رُو سے انہیں اس مقام سے ہٹا دیں گے۔ اور ان کی جگہ وہ قوم لے گی جس کی کبریائی الحق پر مبنی ہوگی۔

(۰)

ان تصریحات سے واضح ہو گیا کہ روزوں کی غرض و غایت اور مقصود و منتہیٰ کیا تھا؟ ان کا مقصد جماعتِ مؤمنین کو اس کے لئے تیار کرنا تھا کہ وہ دنیا میں خدا کی کبریائی متمکن کر سکیں۔ لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ۔ صدرِ اوّل کی جماعتِ مؤمنین تیرہ برس تک مکہ کی زندگی گذارنے کے بعد مدینہ میں آئی تاکہ یہاں کی نسبتاً مساعد فضا میں نظامِ خداوندی کی بنیاد رکھ دی جائے، لیکن مخالفین نے انہیں یہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا اور مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ یہ تھا وہ مقام جب پہلی مرتبہ (۲ھ میں) روزے فرض ہوئے، اور ابھی سترہ دن کے روزے ہی رکھے گئے تھے کہ انہیں بدر کے میدان میں اترنا پڑا اور وہاں ان روزہ داروں نے خدا کی کبریائی کی پہلی اینٹ رکھ دی۔ آپ نے غور فرمایا کہ روزوں کی غایت کیا تھی؟ ـــ لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ۔ خدا کے پروگرام کے مطابق ملک میں اس کی کبریائی قائم کرنا۔ اس زمانے میں مستقل فوج (STANDING ARMY) ہنوز وجود میں نہیں آئی تھی۔ قرآن مجید نے تمام مؤمنین کو مجاہدین (فوج کے سپاہی) قرار دیا تھا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ جس طرح آجکل مستقل فوج سے الگ ـــــ (RESERVISTS) ہوتے ہیں۔ وہ اپنا اپنا کاروبار کرتے رہتے ہیں لیکن انہیں سال میں ایک آدھ ماہ کے لئے بلا لیا جاتا ہے تاکہ وہ فوجی ٹریننگ کی تجدید کر لیں اور بوقتِ ضرورت فوج کے ہمدوش میدانِ جنگ میں نبرد آزما ہوں۔ خدا کی کبریائی کا متمکن مؤمن مجاہدین کا فریضہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ رمضان کا مہینہ انہیں سپاہیانہ زندگی کا خوگر بنانے کے لئے مختص کر دیا گیا تھا۔ حضور نبی اکرمؐ سے جب سوال کیا گیا کہ مؤمن کی زندگی کیا ہے؟ تو فرمایا کہ جب جنگ ہو رہی ہو تو وہ میدانِ جنگ میں ہو۔ اور جب جنگ نہ ہو رہی ہو تو وہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو۔

آپ نے دیکھا کہ مؤمن کی زندگی کا مقصود و منتہیٰ دنیا میں خدا کی کبریائی کو متمکن کرنا ہے اور یہی مقصد روزوں

کا بتایا گیا ہے۔ اس کے لئے رمضان کے مہینے کی تخصیص کیوں کی گئی، اسے خود خدا نے یہ کہہ کر واضح کر دیا کہ۔
شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (۲/۱۸۵) "رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں نزولِ قرآن کی ابتدا ہوئی"۔ قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسان کے لئے نعمتِ عظمیٰ قرار دیا ہے اور ان سے کہا ہے کہ تم ایسی عظیم متاع کے ملنے پر جشنِ مسرت مناؤ۔

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۔ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۔ (۱۰/۵۸)

اے رسول! ان سے کہہ دو کہ تمہیں یہ متاعِ گراں بہا بلا مزد و معاوضہ مل گئی ہے۔ اس کے ملنے پر تم جشن مناؤ۔ تم جو کچھ بھی دنیا میں جمع کرو، یہ اس سے زیادہ گراں قدر ہے۔

لہٰذا، جسے عید الفطر کہا جاتا ہے وہ درحقیقت جشنِ نزولِ قرآن ہے۔ قرآن، خدا کی کبریائی کا ضابطۂ ہدایت ہے اور رمضان کے مہینے کے روزے مجاہدین کو خدا کی کبریائی قائم کرنے اور مستحکم رکھنے کا پروگرام۔ اس پروگرام کے بسخیر و خوبی انجام پانے پر جشنِ مسرت بالکل فطری عمل ہے۔

یہ تھا دین میں روزوں کا مقصد۔ یعنی لتکبروا اللہ علیٰ ما ھدٰکم۔ تاکہ زمین پر خدا کی حکومت قائم کی جائے۔ لیکن جب دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا تو قرآن کریم کے یہ الفاظ تو باقی رہ گئے لیکن ان کی غرض و غایت بالکل بدل گئی۔ آپ قرآن کریم کا کوئی سا با ترجمہ نسخہ اٹھا کر دیکھیں۔ اس میں ان آیات کا ترجمہ ان الفاظ میں ملے گا۔ "تاکہ تم خدا کی بڑائی بیان کرو"۔ یعنی دین میں ان الفاظ کا مفہوم، خدا کی کبریائی قائم کرنا تھا۔ مذہب میں ان کا مطلب خدا کی بڑائی بیان کرنا رہ گیا۔ کبریائی قائم کرنے اور بڑائی بیان کرنے میں جو فرق ہے وہ واضح ہے۔ اس "بڑائی بیان کرنے" کے حکم کی اطاعت کے متعلق کہا گیا کہ نمازِ عید میں جو چھ تکبیریں زائد کہی جاتی ہیں، ان سے اس حکم کی تعمیل ہو جاتی ہے۔ اذان، نماز اور عیدین کی تکبیریں اپنی اپنی جگہ بجا اور درست، لیکن یہ تکبیریں ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ، یا ایک واقعہ کا اعلان تھیں۔ یعنی اس واقعہ کا اعلان کہ یہاں خدا کی کبریائی قائم ہے۔ اس حقیقت کے وقوع پذیر ہوئے بغیر، اس قسم کے اعلانات صرف چند الفاظ کا اعادہ ہیں۔ حقیقت اور اس کی رسمی ادائیگی کا یہی وہ فرق تھا جس کے احساس سے اقبالؒ کے دردمند دل نے باصد آہ و فغاں کہا تھا کہ؎

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملّا کی اذاں اور، مجاہد کی اذاں اور!
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک جہاں میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

یہ مجاہد کی اذان تھی جو دن میں متعدد بار چھت اور مینارہ پر کھڑے ہو کر، دنیا میں اعلان کرتی تھی کہ

اَللّٰهُ اَكْبَرُ

کبریائی صرف خدا کے لئے مختص ہے۔ اس میں کوئی اور شریک نہیں ہو سکتا۔ اور اس کے بعد وہ اعلان کرتا تھا کہ

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

میرا یہ اعلان اس حقیقت کی شہادت دیتا ہے کہ خدا کے سوا کوئی صاحب اقتدار نہیں۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا کہ اس اعلان میں یہ نہیں کہا گیا کہ میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں یا اعلان کرتا ہوں۔ کہا یہ گیا کہ میں اس حقیقت کی "شہادت دیتا ہوں"۔ شہادت اسی کی قابلِ قبول ہوتی ہے جسے اس بات کا ذاتی طور پر علم ہو۔ جو اس کا عینی شاہد ہو۔ اگر کوئی شخص عدالت میں جا کر یہ کہے کہ مجھے اس واقعہ کا ذاتی طور پر تو علم نہیں۔ میرا خیال یہ ہے۔ یا میں نے ایسا سنا ہے تو اس کی شہادت کا قابلِ قبول ہونا تو درکنار اسے درخورِ سماعت بھی نہیں سمجھا جاتا۔ لہٰذا، اشہد ان لا الٰہ اسی کا قابلِ قبول ہوگا جو یہ کہے کہ میں اس کا گواہ ہوں کہ یہاں خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ یہاں خدا کے سوا کسی کی حکومت نہیں۔ یہاں حکمرانی صرف خدا کی ہے۔ جو اس حقیقت کا شاہد نہیں اُسے اشہد ان لا الٰہ الا اللہ کہنے کا حق حاصل نہیں۔ یہی وہ شہادت ہے جس کے متعلق خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ "خدا اس کی شہادت دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں ہے"۔ وَالْمَلٰٓئِكَةُ "اور ملائکہ جو اس کے اس اقتدار کو بروئے کار لانے کے لئے مامور ہیں وہ بھی اس کی شہادت دیتے ہیں"۔ انہیں بھی اس کا حق حاصل ہے کہ وہ بھی اس کی شہادت دیں، کیونکہ وہ اس کے عینی شاہد ہیں۔ اس کے بعد ہے، وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ "ان کے علاوہ وہ لوگ بھی اس کی شہادت دے سکتے ہیں جنہیں اس کا علم بھی حاصل ہے اور پھر وہ ایسا نظام متشکل کئے ہوئے ہیں جس میں خدا کی میزانِ عدل قائم ہے"۔ وہ لوگ ہیں جو اپنے ذاتی علم اور مشاہدہ کی بناء پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۳/۱۷) "خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں اور اس کا اقتدار تنہا قوت پر نہیں، بلکہ قوت کے ساتھ حکمت پر مبنی ہے"۔

آپ نے غور فرمایا کہ ——— قرآن کریم کی رو سے اللہ اکبر کہنے کا حق کسے حاصل ہے؟ رمضان کے روزے جماعتِ مومنین کو اس قابل بنا دینے کے لئے تھے کہ وہ ملک میں خدا کی کبریائی قائم کریں اور پھر ساری دنیا کے سامنے اس کی شہادت دے سکیں۔

یہ ہے عزیزانِ من، میری قرآنی بصیرت کے مطابق صیام کی غرض و غایت اور رمضان کا مقصود و منتہیٰ۔

والسلام

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

———(۰)———

(یہ ہوتا ہے انداز محترم پرویز صاحب کے درسِ قرآن کا۔ یہ درس ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور، میں ہر جمعہ کی صبح بالمشافہ ہوتا ہے، اور مختلف شہروں کی بزم ہائے طلوع اسلام کے زیر اہتمام "ٹیپ ریکارڈر" پر۔ انفرادی طور پر حسبِ فرمائش، ان درسوں کے ٹیپ (CASSETTES) بھی مہیا کئے جا سکتے ہیں۔ (ناظم ادارہ طلوع اسلام لاہور)۔

———(۰)———

طاہرہ کے نام

(بیٹی کے لئے بَر کا انتخاب)

پرویز

پرویز صاحب کی علمی اور تحقیقاتی تصانیف کا اپنا مقام ہے لیکن انہوں نے نئی نسل کے تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہنی انقلاب کے لئے "خطوط" کا جو انداز وضع اور اختیار کیا تھا وہ اپنی افادیت کے اعتبار سے منفرد ہے۔

سلیم کے نام اور طاہرہ کے نام خطوط نے بڑی مقبولیت حاصل کی۔ کچھ عرصہ سے وہ اس گوشے کی طرف مزید توجہ نہیں دے سکے تھے۔ لیکن "قوم کی بیٹیوں" کی طرف سے اس کثرت سے تقاضے موصول ہوئے کہ انہوں نے ایک خط کیلئے وقت نکال ہی لیا۔ طاہرہ بیٹی کے سوال، درحقیقت معاشرہ کے شدید تقاضوں کے ترجمان ہوتے ہیں۔ اور جس مسئلہ پر اس خط میں گفتگو کی گئی ہے، اس نے تو یوں سمجھئے گویا ہمارے ہر گھر کو وقف اضطراب بنا رکھا ہے۔ اس سے اس کی اہمیت واضح ہے۔ ان خطوط میں نام اور مقام حقیقی نہیں بلکہ علامتی ہوتے ہیں۔

طاہرہ بیٹی! بہت بہت دعائیں۔

کسقدر عرصہ دراز کے بعد تمہارا خط آیا۔ لیکن تمہاری یہ خاموشی میرے لئے وجہِ پریشانی ہونے کے بجائے ایک گونہ اطمینان کا باعث رہی، کیونکہ تم اس وقت خط لکھا کرتی ہو جب تمہیں کسی پریشانی کا سامنا ہو۔ لہٰذا تمہاری طرف سے خط نہ آنے سے مجھے اطمینان رہتا ہے کہ تم کسی پریشانی میں مبتلا نہیں ہو۔ موجودہ معاشرہ میں اتنا بھی ازبس غنیمت ہے۔

ابھی کل کی بات ہے کہ تم نے سائرہ بیٹی کی پیدائش پر اس کا نام تجویز کرنے کے لئے لکھا تھا اور آج تم اس کے رشتے کے لئے مشورہ مانگ رہی ہو! اس سے ذہن اس طرف منتقل ہو گیا کہ اس دوران میں خود ہماری عمر کسقدر بڑھ گئی ہے! وقت کی ریگِ رواں نہایت خاموشی سے گرتی رہتی ہے اور ہمیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا کہ اس کے ہر ذرہ کے گرنے سے ہماری عمر کا ایک لمحہ کم ہو جاتا ہے۔

(احباب (بالخصوص قوم کی بیٹیاں) مجھ سے مختلف معاملات میں مشورہ طلب کرتی رہتی ہیں

ان میں میرے لئے سب سے مشکل رشتوں کے معاملہ میں مشورہ دینا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ...

لیکن اس سے پہلے ایک شعر سنو۔ مجھے امید ہے کہ گھریلو جھنجھٹوں نے تمہارے شعر کے ذوق کو گھنایا نہیں ہوگا۔ وہ ریاض (مرحوم) کا شعر ہے جسے تم نے غالباً پہلے بھی سنا ہوگا وہ کہتا ہے:۔

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور ۔۔۔ نکلے جو میکدہ سے تو دنیا بدل گئی

میرے عمر بھر کے تجربہ نے بتایا ہے کہ تم مجوزہ لڑکے کو سیکڑوں نگاہوں سے پرکھو۔ ہزار جہت سے الٹ پلٹ کر دیکھو۔ نکاح کے چار کلمے دہرانے کے بعد نہ معلوم کیا ہوتا ہے کہ اس کی دنیا ہی بدل جاتی ہے۔ وہ اور سے کچھ اور ہو جاتا ہے۔ سو جو دیوارِ لرزاں اس قدر ناقابلِ تیقن (UN-PREDICTABLE) ہو اس کے متعلق یقین کے ساتھ کیا کہا جا سکے۔ ان میں سے جو ذرا زیادہ قریبی ہوتے ہیں ان سے اگر میں (بعض اوقات) کہتا ہوں کہ بیٹا! تم پہلے تو ایسے نہیں تھے، تو وہ نہایت سادگی سے کہہ دیتے ہیں کہ نہیں بابا جان! میں پہلے بھی ایسا ہی تھا۔ مجھ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اور اس کا مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ریاکاری سے ایسا نہیں کہتا۔ وہ سچ مچ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ یہ جو تم آئے دن سنتی رہتی ہو کہ "حقیقی بھائی (یا بہن) کا بیٹا تھا۔ گود کا پلا ہوا، ہاتھوں کا کھلایا ہوا۔ آنکھوں کے سامنے بڑھا، پھولا، پھلا جوان ہوا۔ نہ جانے شادی کے بعد کیا ہو گیا کہ پہلے جیسا رہا ہی نہیں"۔ اس کی یہی وجہ ہے جسے عقل و فکر جواب دے جائے تو اس کے سوا وہ کیا کہے کہ "بہن! پہلے تو میرا ان باتوں پر اعتقاد نہیں تھا لیکن اب سمجھتی ہوں کہ کسی نے اس پر تعویذ کر دیئے ہیں۔ (طاہرہ بیٹی! توہم پرستی مایوسیوں کی پیدا کردہ ہوتی ہے)۔ اگر وہ توہمات کیطرف نہیں جاتی تو یہ کہہ کر اپنی انا کو سنبھالا دے لیتی ہے کہ "بہن! مجھے یہ سب کچھ نظر آتا تھا لیکن بات وہی صحیح ہے کہ یہ سنجوگ کا معاملہ ہے۔ رشتے تو آسمانوں پر طے ہو چکے ہوتے ہیں۔ نکاح پہلے ہی فرشتوں نے پڑھا دیا ہوتا ہے۔ یہاں تو بس ایک رسم پوری کی جاتی ہے"۔ یہ بھی در حقیقت توہم پرستی ہی کی ایک شکل ہے جسے ذرا مقدس بنا لیا گیا ہے۔ تیرا بس نہ پائیں تو نا چار کیا کریں؟

لیکن تم تو نہ تعویذ تاگوں کی قائل ہو، نہ آسمانی نکاحوں کی معتقد۔ اس لئے تمہیں اپنی ذمہ داری سے جی نہیں چرانا چاہیئے۔ اپنی استطاعت کے مطابق دیکھ بھال کر فیصلہ کرنا چاہیئے۔ ان معاملات میں میرا مشورہ بھی یہی ہوتا ہے کہ فیصلہ پوری طرح دیکھ بھال کر کرنا چاہیئے۔

ہماری غلطی در حقیقت دیکھنے بھالنے کی جہتوں کی ہوتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ لڑکا صحتمند

ہے۔ خوبرو اور توانا ہے۔ تعلیم یافتہ ہے۔ برسرِ روزگار ہے۔ گھرانا خوشحال ہے اور معاشرہ میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ (اگر ہم عہدِ جاہلیت کی ان زنجیروں کو ابھی تک نہیں توڑ سکے تو اس کا بھی اطمینان کر لیا جاتا ہے کہ) وہ لوگ اپنی ذات برادری کے ہیں۔ اور رشتے کے خواہشمند ہیں۔ تم سوچو کہ ان تمام معیاروں پر پورا اترنے کے بعد کونسی بات رہ جاتی ہے جو اس کے منتخب کر لینے کی راہ میں حائل ہو؟

لیکن وہ شق جس پر ساری ازدواجی زندگی کا مدار ہے اس کی طرف کسی کی نگاہ نہیں جاتی۔ یہ دیکھا ہی نہیں جاتا کہ لڑکے کا مزاج کیسا ہے۔ افتادِ طبیعت کیسی ہے۔ ذوق کس قسم کا ہے۔ (مختصراً) اس کی نفسیاتی کیفیت کیسی ہے۔ اس کے لئے بیشک گہرے مطالعہ اور طویل مشاہدہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اس کے بغیر ازدواجی زندگی، رفاقت کی نہیں ہو سکتی۔ اس سلسلہ میں میرے چالیس پچاس سال کے تجربہ نے جو مختلف گھرانوں کے احوال و کوائف کے مطالعہ اور مشاہدہ پر مبنی ہے، مجھے جن نتائج پر پہنچایا ہے۔ میں ان سے تمہیں مطلع کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

(۱) اگر لڑکا احساسِ کمتری (INFERIORITY COMPLEX) کا شکار ہے تو صحت، توانائی، تعلیم، روزگار، خاندانی وجاہت، بلند نسبی وغیرہ کے باوجود گھر جہنم بنا رہے گا۔ غالب نے کہا ہے کہ:

جناب شیخ سے مے کا جواز کیا پوچھیں ۔۔۔ کہ چاندنی کو بھی حضرت حرام کہتے ہیں

اس گھر میں چاندنی جھانک نہیں سکتی، پھول کھل نہیں سکتے۔ فضا مہک نہیں سکتی۔ بیوی کی مسکراہٹ دب کر اور بچوں کی ہنسی گھٹ کر رہ جاتی ہے۔ گھر کے در و دیوار مستقل طور پر سیاہ پوش رہتے ہیں۔ بچے اپنے ابو سے بات کرنے کو ترستے رہتے اور کنکھیوں سے اس کے (MOOD) کا اندازہ لگاتے رہتے ہیں۔ بیوی کھل کر بات کرنے کی جرأت نہیں پاتی۔ بچوں کی ہر طبعی حرکت اسے بدتمیزی نظر آتی ہے اور ان کی کھیل کود شرارتیں۔ ان کی کسی فرمائش کا خندہ پیشانی سے پورا کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا "فلسفہ" یہ ہوتا ہے کہ اس سے بچوں کی عادتیں خراب ہو جاتی ہیں۔ معاشرتی روابط سے (خواہ وہ اپنے اعزہ کے ساتھ ہی کیوں نہ ہوں) اس کے نزدیک خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ان "خرابیوں" کی بنیادی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کوئی کسی قسم کی بات کرے اسے اس میں اپنی تذلیل و تحقیر مضمر نظر آتی ہے۔ تم اندازہ لگاؤ کہ اس قسم کے نفسیاتی مریض سے گھر کا نقشہ کیا ہوگا۔ وہ گھر نہیں، نظربندوں کا (SUB-JAIL) ہوتا ہے۔ اور اس کا "سکون" قبرستان کا سکوت۔ مشکل یہ ہوتی ہے کہ اس قسم کے مریض کو باہر کے لوگ، بخال مرنجاں، شریف الطبع، نیک سرشت، "نمازی پرہیزگار" بلکہ اس کی تعریف کرتے رہتے ہیں جس سے اس کا مرض اور بڑھ جاتا ہے وہ احساس کمتری

کے ساتھ خود فریبی کا شکار بھی ہو جاتا ہے۔

(۲) اس کے برعکس؛ ایک ٹائپ ان کا ہوتا ہے جو احساسِ برتری (Superiority Complex) کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کی نگاہوں میں کوئی جچتا ہی نہیں۔ وہ ہر وقت دوسروں کے عیب تلاش کرنے اور کمزوریوں کی ٹوہ لگانے میں لگے رہتے ہیں۔ انہیں اپنے سوا کسی میں کوئی بات قابلِ تعریف نظر نہیں آتی۔ بیوی کے خلاف اسے شکایت ہوتی ہے کہ اس کا "آٹا گوندھتی کا سر کیوں ہلتا ہے" اور بچوں بیچاروں کی ہر وقت شامت آئی رہتی ہے۔ وہ انہیں کہتا ہی "گدھے کے بچے" ہے۔ ہر وقت ماتھے پہ تیوریاں۔ آنکھیں خشمگیں۔ ڈنڈا ہاتھ میں۔ دوسروں کو ذلیل کر کے اسے خوشی حاصل ہوتی ہے۔ بیوی کو اس کے عزیزوں (بلکہ ملازموں تک) کے سامنے ذلیل کرنا اور اس پہ فخر کرتا ہے۔ اس قسم کے بزعم خود غلط، ہمہ داں، خود بین و خود آرا قسم کے شوہر گھر کو عقوبت خانہ بنائے رکھتے ہیں۔ لوگ اس کی تعریف میں رطب اللسان ہوتے ہیں کہ بڑا جری، بیباک اور حق گو ہے۔ سچ بات ہر ایک کے منہ پہ کہہ دیتا ہے۔ ذرا سی لگی لپٹی نہیں رکھتا۔ ان قصیدوں میں مست، وہ احتسابِ خویش کی ضرورت ہی نہیں سمجھتا۔

(۳) ایک ٹائپ ان کا بھی ہے جن کا مقصدِ زندگی جمع مالاً و عددہ۔ پیسہ پیسہ جمع کرتے رہنا ہوتا ہے۔ وہ بیوی کو آٹا تک ماپ کر دیتے ہیں اور پھر دیکھتے ہیں کہ کوئی روٹی بچ تو نہیں گئی۔ بچی ہوئی روٹی کو خود دسترخوان میں لپیٹ کر رکھ لیتے ہیں کہ بیوی اسے کسی فقیر کو نہ دے دے۔ اس سے یہی نہیں کہ گھر کی ضرورتیں کشادگی سے پوری نہیں ہوتیں، بیوی کی عزتِ نفس سخت مجروح ہوتی ہے اور اسے ذرا سی بھی خود اعتمادی حاصل نہیں ہوتی۔ وہ اپنے رشتہ داروں اور دیگر ملنے جلنے والوں کی نگاہ میں اپنے آپ کو ذلیل محسوس کرتی ہے بچے جب اپنا مقابلہ اپنے ہم جماعتوں سے کرتے ہیں تو ان میں بچپن ہی سے احساسِ کمتری پیدا ہو جاتا ہے۔ جب اس سے کہا جائے کہ بیوی بچوں کی ضرورت پوری کرنے میں اس قدر خساست نہیں برتنی چاہیئے تو جواب میں کہتے ہیں کہ میں انہی کے بھلے کے لئے ایسا کرتا ہوں۔ یہ سب انہی کے لئے ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ قبر میں تھوڑا لے جاؤں گا: اسے کون سمجھائے کہ بہترین مسالہ بنیادوں میں بھرنا چاہیئے۔ جس عمارت کی بنیادیں کمزور رہ جائیں وہ حوادثِ زمانہ کا ایک جھٹکا بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ زندگی کی بنیادیں دولت پہ نہیں۔ انسانیت پہ اٹھتی ہیں لیکن یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ وہ گھر کو بدستور جیل خانہ بنائے رکھیں گے جس میں ہر قیدی کو گنی چنی روٹیاں۔ پتلی دال اور بنسر والا کپڑا ملتا ہے۔

(۴) ایک بات اور بھی یاد رکھو۔ جو لوگ جہیز کا مطالبہ کریں انہیں رشتہ بالکل نہ دو۔ ان کی ذہنیت کاروباری ہوتی ہے۔ وہ شادی کو رفاقت نہیں سمجھتے۔ آمدنی کا ذریعہ تصور

کرتے ہیں۔ ایسا لڑکا جہیز تک ہی محدود نہیں رہتا۔ وہ ساری عمر بیوی کو تنگ کرتا رہتا ہے کہ ماں باپ کے ہاں سے یہ لاؤ اور وہ لاؤ۔ اور جب بھی اس کا کوئی تقاضا پورا نہیں ہوتا، وہ بیوی کو نکال باہر کرتا ہے۔

(۵) ایک "ٹائپ" "مجنوں" قسم کا بھی ہوتا ہے جو کہتا ہے کہ اگر میری شادی یہاں نہ ہوئی تو میں خودکشی کر لوں گا! وہ اگر ڈرامہ کرتا ہے تو منافق اور فریب کار ہے جس سے بچنا ضروری ہے۔ اگر خلوصِ دل سے ایسا کہتا ہے تو شدید قسم کا جذباتی ہے۔ اس سے بھی بچنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ازدواجی زندگی ہنگامی جذبات کے سہارے نہیں چل سکتی۔ یہ استقامت اور اعتدال چاہتی ہے۔ عمر بھر کی استقامت اور عقل و جذبات میں اعتدال۔ "دیر جنوں از خود نہ رفتن" کا سا اعتدال۔ ازدواجی زندگی "فلاسفروں" کی کامیاب ہوتی ہے نہ "عاشقوں" کی۔ (فلاسفروں) کی کار میں پٹرول ہی پٹرول ہوتا ہے، موبل آئل نہیں ہوتا۔ ان کی گاڑی میں پٹرول کی ٹینکی تک میں بھی موبل آئل بھرا ہوتا ہے۔ گاڑی نہ اُن کی چل سکتی ہے نہ اِن کی۔

سائرہ بڑی حساس بچی ہے۔ بڑی خوش ذوق، بلند نگاہ، کشادہ ظرف، خندہ جبیں۔ اعلیٰ تعلیم کے ساتھ سلیقہ شعار۔ اس کے لئے رفیقِ زندگی کی تلاش اور اس کا انتخاب کرتے وقت جہاں اس کی ان خصوصیات کا خیال رکھنا ہوگا وہاں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ لڑکا ان نفسیاتی امراض کا شکار نہ ہو جن کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔

تم کہو گی کہ چچا جان! میں نے آپ سے مشورہ مانگا اور آپ نے مجھے صحرا میں لا کر چھوڑ دیا۔ آپ فرمایئے کہ ایسا کہاں سے لاؤں کہ اس سا کہیں جسے! ان خصوصیات کا لڑکا ملے گا کہاں سے؟ میں سوچتا ہوں کہ تم کہیں وہ کہانی نہ دُہرا دو جو میں نے کبھی تمہیں سنائی تھی۔ مولوی صاحب وعظ میں کہہ رہے تھے کہ جنت میں جانے کا راستہ (پل صراط) جہنم کے اوپر سے گزرتا ہے۔ بال سے باریک، تلوار سے تیز۔ ذرا پاؤں میں لغزش آئی اور انسان سیدھا جہنم میں گرا۔ سامعین میں سے ایک بوڑھے پٹھان نے کہا: مولوی صاحب! سیدھی طرح یہ کیوں نہیں کہتے کہ جنت میں جانے کا کوئی راستہ نہیں۔ تم بھی یہی کہو گی۔ اور تم ہی نہیں، معیاری انسان کی تلاش میں تو بڑے بڑے دانشور بھی کہتے کہتے تھک کر بیٹھ گئے۔ تمہیں رومی کی وہ غزل تو یاد ہوگی جسے اقبال نے "اسرار و رموز" میں بطور افتتاحیہ درج کیا ہے۔ یعنی:

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر　　کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

میں نے کل شیخ کو دیکھا کہ دیا ہاتھ میں لئے شہر میں پھر رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ میں ان چرندوں درندوں سے تنگ آگیا ہوں اور کسی انسان کی تلاش میں ہوں۔

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما۔ (میں نے کہا کہ میں نے بھی بہت تلاش کیا ہے انسان کہیں نہیں ملتا)۔

گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست (کہنے لگا کہ جو مل نہیں سکتا اسی کی تو مجھے تلاش ہے) دیکھنا! اس معیارِ انتخاب کو پلے باندھ کر، تم کہیں سائرہ کو ساری عمر گھر میں نہ بٹھائے رکھنا۔ میں نے کئی لڑکیوں کو دیکھا ہے جنہوں نے اس معیاری تلاش میں سر سفید کر لیا۔ عملی زندگی میں حضرت عمرؓ کے اس اصول کو چراغِ راہ بناتا کہ شادی کے معاملہ میں نظری معیار (IDEALISM) سے کام نہیں چلتا۔ اس کے لئے (ADJUSTMENT) کچھ لو، کچھ دو کا شیوہ اختیار کرنا چاہیئے۔ ان سے کسی نے کہا کہ آپ تو ہر وقت دُرہ ہاتھ میں لے پھرتے رہتے ہیں، گھر میں آپ کا گزارہ کیسے ہوتا ہے! فرمایا کہ گھر کی زندگی میں میں نے یہ اصول اختیار کر رکھا ہے کہ انسان کو گھر میں بچہ بن کر رہنا چاہیئے اور مرد اس وقت بننا چاہیئے جب گھر والوں کی کوئی ضرورت پوری کرتی ہو۔

یہی اصول تم سائرہ کے کان میں بھی ڈال دو کہ شادی کے معاملہ میں (IDEALISM) سے کام نہیں چلتا اس میں (ADJUSTMENT) کی ضرورت ہوتی ہے۔

انتخاب کے معاملہ میں جو کچھ میں نے ابھی تک کہا ہے وہ تو کتابِ معیار کا دیباچہ ہے۔ اصل کتاب اب شروع ہوتی ہے جس کا سرنامہ ہے۔ ساس۔ یہ وہ گرہ ہے جو کسی سقراط سے بھی آج تک نہیں کھل سکی۔ ساس بہو کے رشتے کے متعلق تم نے وہ کہاوت تو سنی ہو گی۔ پڑوسن نے پوچھا کہ بہن! کہو، نئی بہو کیسی ہے، کہنے لگی۔ بی بی کیا پوچھتی ہو۔ میں تو شروع ہی سے بدنصیب رہی جب بہو تھی تو ساس کام کی نہ ملی اب ساس ہوں تو بہو کام کی نہیں ملی۔ یہ ملخص ہے ہمارے معاشرہ میں ساس اور بہو کے رشتے کا۔ اس کی ساس نے جو کچھ اس کے ساتھ کیا تھا یہ اپنی بہو سے (شعوری یا غیر شعوری طور پر) اس کا انتقام لیتی ہے۔ بے شک ایسی ساس بھی مل جائے گی جس نے بہو کو بیٹی کی جگہ رکھا تھا۔ لیکن یہ مستثنیات ہیں۔ ویسے معمولاً وہی ہوتا ہے جو پہلے کہا گیا ہے۔ میں نے اچھی خاصی سمجھ دار خواتین کو دیکھا ہے۔ رشتہ لینے کے لئے پھیرے کرتے کرتے جوتیاں ٹوٹ گئیں، منتیں خوشامدیں کرتے دانت گھس گئے، عزیزوں رشتہ داروں سے فرمائشیں ڈلوانے سے کام نہ چلا تو مزاروں پر منتیں مانیں، شاہ جی سے دعائیں کرائیں، تعویذ تاگوں سے گھر بھر دیا۔ برسوں کی انتھک کوششوں کے بعد رشتہ ملا تو شادی کو ہفتہ بھر بھی نہیں گزرا ہو گا کہ بہو میں کیڑے ڈالنے شروع کر دیئے[1] اور بہو بھی کوئی ان دیکھی، اجنبی

[1] ان موضوعات پر میری کتاب "طاہرہ کے نام خطوط" دیکھئے۔

نہ تھی، سگی بہن کی بیٹی! یہ بیچاری ناتجربہ کارہ ان واردات میں نو وارد۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ ہوا کیا ہے! کل تک یہ گھر میرا اپنا (یعنی خالہ کا) گھر تھا۔ یہ میری خالہ تھیں جو اس قدر پیار کیا کرتی تھیں۔ یہ میری خالہ زاد بہنیں تھیں جو ایسی محبت کے ساتھ پیش آتی تھیں۔ آج اس سے کیا قصور سرزد ہو گیا کہ اس گھر کی دیواریں تک اس کی دشمن ہو گئیں۔۔۔ یہ تبدیلی ایسی تھی جو اس کی کیا، کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی۔ صبح سے شام تک طعن و تشنیع کے نشتر اس کے معصوم سینے کو نشتر بنا رہے تھے۔ یہ حرفِ شکایت تک زبان پر نہیں لاسکتی تھی۔ تنہائی میں خاوند سے کچھ کہتی تو وہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے کہہ دیتا کہ تم دیکھ رہی ہو کہ میں کس قدر مجبور ہوں۔ تم اسے برداشت کرو۔ اس کا علاج کیا ہو سکتا ہے؟ اور اگر اس نے بچپن سے یہ سن پایا ہے کہ "جنت ماں کے پاؤں تلے ہوتی ہے"۔ تو ماں کے خلاف حرفِ شکایت تک سننا بھی اسے گوارا نہیں ہوگا۔

تمہیں یاد ہوگا، طاہرہ بیٹی! کہ جب تم نے جاوید میاں کی شادی کے سلسلہ میں دریافت کیا تھا تو میں نے کہا تھا کہ جب تک ایسا انتظام نہ ہو جائے کہ یہ میاں بیوی اپنے مکان میں الگ رہیں اس وقت تک اس کی شادی نہ کرنا۔ یہ مشورہ میں نے ان حالات میں دیا تھا جب ماں اور ساس تمہارے جیسی تھی۔ اور اب تو سائرہ نے کسی ان دیکھے گھر جانا ہے۔ اس لئے میری اس نصیحت کو کبھی نظر انداز نہ کرنا کہ بیٹی کی شادی اس لڑکے کے ساتھ کرنا جو معاشی طور پر ماں باپ کا محتاج نہ ہو، اور شادی کے بعد میاں بیوی اپنے الگ گھر میں رہیں۔ تم دیکھو گی کہ اس سے کم و بیش ہر ایک کے ساتھ تعلقات خوشگوار رہیں گے۔

اور سب سے آخر وہ وارننگ جسے اس باب میں سرِفہرست ہونا چاہیئے۔ وہ یہ کہ ایسے لڑکے کے قریب تک نہ جانا جو مذہب پرست ہو (دین کا معتقد نہیں مذہب پرست جسے آج کل اسلام پسند کہہ کر پکارا جاتا ہے)۔ وہ بچپن سے اس قسم کی آوازیں ہر محراب و منبر سے سنتا چلا آتا ہے اور انہیں عقیدہ کی حیثیت سے مانتا ہے کہ مرد عورتوں پر حاکم اور داروغہ ہیں، عورت مرد کی پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔ اگر اسے سیدھا کرنے کی کوشش کی جائے گی تو وہ ٹوٹتے ٹوٹ جائے گی، سیدھی نہیں ہوگی، خاوند بیوی کو مار پیٹ بھی سکتا ہے۔ اس سے یہ نہیں پوچھنا چاہیئے کہ اس نے بیوی کو کیوں مارا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ، اگر میں کسی کو حکم کر سکتا کہ اللہ کے سوا کسی اور کو سجدہ کرے تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ (آپ نے فرمایا کہ)

میرے ایسے مردوں کے لئے کوئی فتنہ عورتوں سے زیادہ باعثِ مضرت نہیں ، یہ اور اسی قسم کی اور وضعی روایات ہمارے ہاں متداول چلی آ رہی تھیں کہ اب "سمند نازپہ اک اور تازیانہ ہوا ہے"۔ آج کل پاکستان میں اس قسم کے قوانین مرتب اور نافذ ہو رہے ہیں جن کی رُو سے فوجداری مقدمات میں عورت کی شہادت سرے سے قابلِ قبول نہیں۔ اور جن معاملات میں اس کی گواہی تسلیم کی جا سکتی ہے ان میں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہوگی۔ حتیٰ کہ اگر عورت قتل ہو جائے تو اس کی دیت یعنی اس کی جان کی قیمت) مرد کی دیت سے آدھی ہوگی۔

تم سوچو، بیٹی! کہ جو لڑکا ان امور کو خدا اور رسول کے ارشادات اور شریعت کے احکام تسلیم کرتا ہو، وہ سفرِ زندگی میں بیوی کے ہمدوش چلنے کا تصور بھی کر سکے گا! رفاقت، مساوات چاہتی ہے، لیکن اس کے نزدیک مرد اور عورت کی مساوات اس کے عقائد کے خلاف ہوگی۔ بیوی کو برابری کا درجہ دینے کا تصور تک اس کے نزدیک گناہ ہوگا۔ وہ بیوی کو "جوتی تلے" رکھے گا اور خوش ہوگا کہ وہ احکامِ شریعت کا اتباع کر رہا ہے۔

معاشرہ میں اس قسم کی روایات اور معتقدات کے صدیوں سے متداول چلے آنے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے "ماڈرن" طبقہ کا تحت الشعور بھی ان سے متاثر ہے ہمارے معاشرہ میں بیوی تو میاں کو التزاماً "آپ" کہہ کر مخاطب کرتی ہے لیکن بہت کم شوہر ہوں گے جو بیوی کو "آپ" کہہ کر پکاریں۔ وہ اسے "تم یا تو" ہی کہے گا۔ انگریزی زبان ان کی پردہ پوشی کر دیتی ہے۔ اس میں (YOU) دونوں کے لئے آتا ہے۔ اس سے ان کی جھجک بھی دُور ہو جاتی ہے اور بات بھی بنی رہتی ہے۔ لیکن جہاں ضرورت اپنی زبان میں بات کرنے کی ہو، آپ اور تو کی تفریق چھلک کر باہر آ جاتی ہے۔

غیر شعوری طور پر ہی سہی، عورت کو کمتر سمجھنے کا احساس بیوی تک ہی محدود نہیں ہوتا۔ اس کے خاندان تک کو بھی محیط ہوتا ہے۔ تم نے قریب قریب ہر گھر میں دیکھا ہوگا کہ "داماد" جب سسرال آتا ہے (تو اس کے اپنے گھر میں خواہ اسے کوئی پوچھتا تک نہ ہو) یہاں وہ اپنے آپ کو شہزادہ سے کم نہیں سمجھتا۔ خصوصی خاطر مدارت کے علاوہ وہ متوقع ہوتا ہے کہ اس گھر کا ہر فرد اس کے اشارۂ ابرو کا منتظر رہے۔ اس دوران میں بیوی بیچاری عجیب ضیق میں مبتلا رہتی ہے۔ اسے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اس کے ماں باپ، بہن بھائی تو ایک طرف، اس کے عزیز رشتہ داروں کی طرف سے بھی کوئی بات یا کوئی حرکت بھی ایسی سرزد نہ ہو جائے جو "میاں صاحب" کی طبعِ نازک پر گراں گذرے۔ اگر سوءِ اتفاق سے کہیں ایسا ہو جائے تو اس ناکردہ گناہ کا اس کا جو خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں یہی صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب لڑکی کی

ماں، اس کی ساس یا نند کے متعلق کوئی ایسی بات کہہ دے جو انہیں ناگوار گزرے۔ یہ معاملات بڑے نازک ہوتے ہیں۔ ان میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے معاشرہ میں بیٹی کی شادی کے متعلق بس یہی سمجھو کہ۔ دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے۔

بات سسرال کے ہاں کی چلی ہے تو اس کا ایک گوشہ اور بھی سامنے آتا ہے جسے میں بصد تامّل نوکِ قلم پہ لا رہا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ بیوی کے بھائی کو "سالہ" کہتے ہیں، اور "سالہ" ہمارے ہاں گالی ہے۔ اسی طرح "سسرہ" کا لفظ بھی۔ کل تک یہ "سالے اور سسرے" عزت اور شرافت کے حامل سمجھتے۔ ایک بیٹی کی شادی کر دینے سے گالی بن گئے (میں یہ کہہ رہا ہوں اور میرا کلیجہ شق ہو رہا ہے)۔ ماڈرن طبقہ نے اس منقصت کو چھپانے کے لئے انگریزی زبان کا سہارا لینا شروع کر دیا۔ وہ (IN-LAWS) کہتے ہیں۔ یہ بہرحال بہتر ہے، اگرچہ اس میں ایک دقت پیش آتی ہے۔ BROTHER-IN-LAW سالے کو بھی کہتے ہیں اور بہنوئی کو بھی۔ اور جب رشتہ کا تعارف متعین طور پر کرانا ہو تو پھر اسی پستی میں اترے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔

میرا یہ کچھ لکھنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ عورت کو ذلیل سمجھنے کے شجرۃ الزقوم (جہنم کے زہریلے درخت) کی شاخیں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ قرآن نے نسب اور صہر (سسرال) دونوں رشتوں کا ذکر کیا ہے (۲۵/۵۴) کیسا جنت بداماں ہوگا وہ معاشرہ جس میں عورت اور مرد کو یکساں عزت و تکریم کا مستحق سمجھا جائے اور پھر اس شجرِ طیب کی ہر شاخ گل بداماں اور ثمر بداماں ہو۔ انسان اسی معاشرہ میں اپنے مقامِ انسانیت تک پہنچ سکے گا جس میں ہر فرد دوسرے کا احترام کرے۔

کچھ باتیں سائرہ بیٹی کے لئے بھی۔ اگرچہ وہ تعلیم میں ہم سے بھی آگے ہے (وہ تو ماشاء اللہ پی۔ ایچ۔ ڈی ہے) لیکن ایک گوشہ ایسا ہے جس میں ہمیں سبقت حاصل ہے۔ اور وہ ہے تجربہ۔ میں جو کچھ نونہالانِ ملت سے کہا کرتا ہوں اس کی بنیاد (قرآنی حقائق کے ساتھ) تجربہ ہوتی ہے۔ اور چونکہ یہ "متاع" انہیں ہنوز حاصل نہیں ہوتی اس لئے وہ ہم، بڑے بوڑھوں کی باتیں تحمل کے ساتھ سن لیتے ہیں۔

شادی کے ساتھ مرد، عورت (میاں بیوی) ایسی وادی میں داخل ہوتے ہیں جس سے وہ قطعاً ناآشنا ہوتے ہیں۔ اس لئے انہیں اس میں سنبھل سنبھل کر قدم رکھنا چاہیئے۔ کسی فیصلہ میں جلدبازی سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ سائرہ بیٹی کا واسطہ ایک ایسے مرد سے پڑے گا جو ابھی کل تک اجنبی تھا۔ اس کے متعلق جو معلومات اسے حاصل ہوں گی، انہیں اس کا حدود اربعہ سمجھنا چاہیئے "وہ ہے کیا" اس کا اسے کچھ علم نہیں ہوگا۔ اسے سمجھنے کے لئے کافی وقت اور ضبط درکار ہوگا۔

اس کے متعلق عجلت میں کوئی رائے قائم نہیں کرنی چاہیئے۔ ازدواجی زندگی عمر بھر کی رفاقت ہوتی ہے۔ اور رفاقت، ہم آہنگی چاہتی ہے۔ اس مقصد کے لئے سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ مزاج۔ ذوق۔ طبیعت۔ دلچسپی اور رجحان کے علائق۔ اور زندگی کے مقاصد اور ان کے حصول کے طرق و ذرائع میں کون کون سے امور میں یکسانیت کی تو دُور کی بات ہوگی، کم از کم) اشتراک ہے، اور کس حد تک۔ ان مشترک اقدار میں خاوند کے ہمدوش چلنا چاہیئے اور اختلافی امور کو چھیڑنا نہیں چاہیئے۔ جوں جوں مشترک امور میں ہم آہنگی بڑھتی جائیگی اختلافی امور کا بُعد کم ہوتا جائے گا۔ اس کے لئے وقت درکار ہوگا۔ اس کے اسباب کچھ بھی ہوں، جب یہ امر واقعہ ہے کہ ہمارے معاشرہ میں مردوں کے تحت الشعور میں یہ (غلط) احساس جاگزیں ہے کہ عورتیں، مردوں سے کم تر ہوتی ہیں، تو اگر کسی وقت خاوند کیطرف سے اس جذبہ کا اظہار ہو جائے تو اسے اپنی توہین سمجھ کر روٹھ کر نہیں بیٹھ جانا چاہیئے۔ اسے ہنس کر ٹال دینا چاہیئے۔ تاآنکہ اسے خود اپنی اس غلطی کا احساس ہو جائے۔ اگر شریف النفس انسان کے ایگو کو مجروح نہ کیا جائے تو اسے اپنی غلطی کا احساس جلد ہو جاتا ہے۔ اختلافی امور سے متعلق گفتگو میں اپنی آواز کو خاوند کی آواز (PITCH) سے نیچے رکھنا چاہیئے میاں بیوی یوں سمجھو کہ ٹینس کے کھلاڑی ہوتے ہیں۔ اگر ایک طرف سے (STROKE) ہلکا لگایا جائے تو دوسری طرف کی شدت خود بخود کم ہو جاتی ہے۔ اختلافی نزاع کو کبھی اپنی انا کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیئے۔ ارشاد خداوندی ہے۔ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ (۵/۴۸) دوسرے سے آگے بڑھنا چاہتے ہو تو حسن و خوبی کے امور میں آگے بڑھو۔ اپنی انا کا مظاہرہ ان امور میں کرو۔ اس سے انا (ایگو) نہیں رہتا خودی (PERSONALITY) بن جاتا ہے۔

پھر اسے بھی ہمیشہ پیش نظر رکھو کہ میاں بیوی کی زندگی "ہم زاد" ہی کی نہیں ہوتی "ہم راز" کی بھی ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے اسے "لباس اور بدن" کی تشبیہ سے واضح کیا ہے۔ اس لئے میاں بیوی کا راز، میاں بیوی تک ہی رہنا چاہیئے۔

جسطرح تم چاہتی ہو کہ خاوند تمہارے ماں باپ بہن بھائیوں کی عزت کرے اور ان سے شفقت اور محبت سے پیش آئے، اسی طرح تم بھی اس کے والدین اور اعزہ کی عزت کرو اور ان سے شفقت سے پیش آؤ۔ زندگی ہمیشہ تعاون (RECIPROCITY) چاہتی ہے۔ دونوں ہاتھوں سے تالی بجتی ہے، ایک ہاتھ سے چپت لگتی ہے۔

جاتے جاتے، دو ایک باتیں خود تمہارے لئے بھی۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں سائرہ سے بڑا پیار ہے تم نے اسے بڑے چاؤ چونچلوں سے پالا ہے۔ اس نے گھر بھر کو سنبھال بھی رکھا ہے اس کی شخصیت کو (خدا وہ دن خیریت سے لائے) تم بہت محسوس کرو گی۔ اس کے لئے تمہیں تیار رہنا

چاہیئے۔ یاد رکھو! جہاز بیشک گودیوں میں محفوظ رہتے ہیں، لیکن جہازوں کو گودیوں میں باندھ رکھنے کے لئے تو بنایا نہیں جاتا۔ انہیں سمندر کی موجوں کے حوالے کرنا ہوتا ہے۔ بچیوں کو وداع کرنے کے بعد ہمارے نیک آرزوئیں ان کے ساتھ رہنی چاہئیں اور مفید مشورے۔ لیکن ہمیں مشورے اپنے حالات پر قیاس کر کے نہیں دینے چاہئیں۔ ان کے حالات اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق دینے چاہئیں۔ اور اس پر اصرار نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ من وعن تمہارے مشورہ پر عمل کرے۔ مشورہ کو مشورہ ہی رہنے دینا چاہیئے آرڈیننس نہیں بنا دینا چاہیئے۔ پھر اسے بھی ملحوظ رکھنا کہ نئی نسل بیشتر امور میں ہم سے کہیں آگے ہے۔ ہمیں ان کا احترام کرنا چاہیئے۔

لڑکی کو رخصت کرنے کے بعد تم نے اس کے ماں باپ کو اکثر کہتے سنا ہو گا کہ خدا کا شکر ہے بوجھ سر سے اتر گیا۔ یہ صحیح نہیں۔ یہ بوجھ تو زندگی بھر سر پہ رہتا ہے۔ رخصتی سے لڑکی کے مسائل (PROBLEMS) ختم نہیں ہو جاتے۔ اس کے بعد اس کے نئے مسائل شروع ہوتے ہیں۔ ہمارے معاشرہ میں بیٹی کا تعلق ماں باپ کے ساتھ کب تک رہتا ہے، یہ راز مجھے ہمارے گاؤں کی ایک بڑھیا (خالہ) نے بتایا۔ تمہیں معلوم ہے کہ (ہماری) اماں جی (مرحومہ) گاؤں رہا کرتی تھیں۔ ہم یہاں شہر میں رہتے تھے۔ انہوں نے قریب سو سال کی عمر میں وفات پائی۔

وفات کی خبر سن کر ہم سب وہاں گئے۔ میں نے چھوٹے بھائی سے کہا کہ وہ سامنے قصبے سے کفن دفن کا سامان لے آئے۔ پاس ہی ایک بڑھیا (خالہ) کھڑی تھی۔ اس نے کہا کہ بیٹا! تم نے بھائی سے کیا کہا ہے۔ میں نے کہا کہ اس سے کہا ہے کہ جا کر کفن دفن کا سامان لے آئے۔ یہ سن کر اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا کہ ہم نے سن رکھا تھا کہ تم بڑے عالم فاضل ہو لیکن آج معلوم ہوا کہ تمہیں کچھ بھی نہیں آتا۔ تمہیں معلوم نہیں کہ بیٹی کا کفن اس کے میکے والوں کے ذمہ ہوتا ہے۔ یہ ہمارے گاؤں کی بیٹی تھی۔ اس کا کفن دفن ہمارے ذمہ ہے۔ تم (سسرال والوں) کے ذمے نہیں۔ اس بوڑھی خالہ نے تو معمول کی بات کہہ دی لیکن میرے سامنے سوچ کے کئی دروازے کھول دیئے۔ میں نے سوچا کہ جس معاشرہ میں بیٹی کے ماں باپ کے ساتھ تعلق کی یہ کیفیت ہے کہ اس کا کفن دفن بھی انکے ذمہ ہوتا ہے، اسے گھر سے رخصت کر کے یہ سمجھ لینا کہ اس کی ذمہ داری ختم ہوئی، کم فہمی ہے۔ اس کے ساتھ تو عمر بھر کا رشتہ رہتا ہے۔ مغربی معاشرہ اس رشتے کی گہرائی اور پہنائی کو کیسے سمجھ سکتا ہے جہاں بالغ ہو جانے کے بعد بیٹی ماں باپ کے گھر میں (PAYING GUEST) کی حیثیت سے رہتی ہے۔ اور رخصتی کے وقت بیلو ڈیڈ اور بیلو ممی کہکر روانہ ہو جاتی ہے اور پھر پلٹ کر بھی نہیں دیکھتی۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ مشرق کی وہ "باہمگی" اور مغرب کی یہ "بے ہمگی" دونوں انتہائی (EXTREMES) ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے

ص۱ ہماری زبان میں اس کے لئے کوئی لفظ نہیں۔ اس لئے کہ ہمارے ہاں اس کا تصور بھی نہیں ہو سکتا کہ مہمان (PAYING) بھی ہو سکتا ہے۔

کہ اولاد سے پرورش کی مدت تک تعلق حیوانات کو بھی رہتا ہے۔ انسانی تعلقات وہیں تک نہیں ہوتے۔ قرآن مودۃ فی القربیٰ کی تلقین کرتا ہے۔ جو حیوانی سطح سے اوپر کی بات ہے۔

لیکن بیٹی کے ساتھ عمر بھر رشتہ استوار رکھنے کے باوجود، کوشش یہ کرنی چاہیئے کہ وہ اپنے (اُس) گھر کو بسائے۔ ادھر کی ہو کر نہ رہ جائے۔ اس حقیقت کو اسے (اور خود ماں باپ کو) پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ لڑکی کا گھر اُس کا وہی گھر ہوتا ہے۔ ماں باپ کا گھر تو یوں سمجھئے گویا تکان اتارنے کے لئے تفریح گاہ ہوتا ہے۔

خط خاصا لمبا ہو گیا۔ لیکن اتنے عرصہ کے بعد خط لکھتے میں ایسا ہونا چاہیئے تھا۔ اچھا خدا حافظ۔ سائرہ بیٹی کو بہت بہت دعائیں۔

تمہارا چچا جان:۔ پرویز

مئی ۱۹۸۴ء

طاہرہ کے نام خطوط

پرویز صاحب کے خطوط کا سلسلہ ہماری تعلیم یافتہ نئی نسل میں بڑا مقبول ہوا ہے اور ان کے قلب و دماغ میں جو صحیح انقلاب آیا ہے اسکا بیشتر حصہ انہی خطوط کا رہینِ منت ہے۔ سلیم کے نام خطوط (تین جلدوں میں) نوجوان طلباء کے نام ہیں اور طاہرہ کے نام، طالبات کے لئے جس میں بالخصوص عورتوں سے متعلق مباحث کو قرآن مجید اور علوم حاضرہ کی روشنی میں سلجھایا گیا ہے۔ یہ سلسلہ خواتین کے حلقہ میں بڑی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے اور انہوں نے اسے بڑا مفید پایا ہے ـــــ قیمت ۱۰/- روپے علاوہ محصول ڈاک ـــــ

(۱) مکتبۂ دین و دانش، چوک اردو بازار لاہور

(۲) ادارہ طلوعِ اسلام بی ۲۵ گلبرگ ۲ لاہور

ایک اہم قرآنی نکتہ کی وضاحت

(ڈاکٹر سید عبدالودود)

آیت ($\frac{46}{15}$) کی رُو سے، حمل اور رضاعت کی مدت تیس ماہ ہے۔ آیت ($\frac{31}{14}$) کی رُو سے، رضاعت کی مدت دو سال ہے۔

اس حساب سے، حمل کی مدت چھ ماہ رہ جاتی ہے جو واقعہ کے خلاف ہے۔

ان آیات میں تطبیق دینے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب نے اس مسئلہ پر ایک نئے زاویۂ نگاہ سے غور کیا ہے جو فکر و تدبّر کا متقاضی ہے۔ چونکہ مسئلہ (حمل کی مدت) کا تعلق علوم سائنس سے ہے، اس لئے اس پر غور کرنے کے لئے ایک ڈاکٹر بہتر پوزیشن میں ہو سکتا ہے۔ ہم ڈاکٹر عبدالودود صاحب کی اس فکری کاوش کو بہ تشکر شائع کرتے ہیں۔ (طلوعِ اسلام)

قرآن کریم کی چند آیات کے مطالعہ کے بعد ایک دلچسپ نکتہ سامنے آتا ہے جو قارئین کے پیش خدمت ہے۔ نکتہ یہ ہے کہ رحم مادر کے اندر قرار حمل سے لے کر کم از کم کتنی مدت کے بعد بچہ پیدا ہو تو زندہ رہ سکتا ہے۔ اسے سائنس کی زبان میں (VIABLE AGE OF FETUS) کہتے ہیں پہلے میں قرآنِ کریم کی آیات پیش کرتا ہوں، بعد میں اس نکتہ پر بحث ہوگی۔ آیات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۭ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ ... (۲ : ۲۳۳) "اور مائیں اپنے بچوں کو پورے ۲ سال دودھ پلائیں۔ یہ (حکم) اس شخص کے لئے ہے جو پوری مدت تک دودھ پلوانا چاہے اور دودھ پلانے والی ماؤں کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق باپ کے ذمہ ہوگا"

۲۔ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسَانًا ۭ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۭ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا (۴۶ : ۱۵) "اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم دیا ہے اس کی ماں نے اس کو تکلیف سے پیٹ میں رکھا اور تکلیف ہی سے جنا اور اس کا پیٹ میں رہنا اور دودھ چھوڑنا تیس ماہ میں ہوتا ہے"

۳۔ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰي وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ (۳۱ : ۱۴)

اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ (بھلائی کی) تاکید کی ہے۔ اس کی ماں تکلیف پہ تکلیف سہ کر اسے پیٹ میں اٹھائے رکھتی ہے اور دو برس میں اس کا دودھ چھڑانا ہوتا ہے۔

ہمارے مفسرین نے مندرجہ بالا آیات سے چند قانونی نکات اخذ کئے ہیں۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) تفہیم القرآن صفحہ ۶۱۰ پر لکھتے ہیں۔ "اس آیت (یعنی ۱۵: ۴۶) اور سورۂ لقمان کی آیت (۱۴: ۳۱) اور سورۂ بقرہ کی آیت (۲: ۲۳۳) سے ایک قانونی نکتہ بھی نکلتا ہے۔ جس کی نشاندہی ایک مقدمے میں حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ نے کی اور حضرت عثمانؓ نے اس کی بنا پہ اپنا فیصلہ بدل دیا۔ نقطہ یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں ایک شخص نے قبیلہ جہینہ کی ایک عورت سے نکاح کیا اور شادی کے چھ ہی مہینے بعد اس کے ہاں صحیح سالم بچہ پیدا ہو گیا۔ اس شخص نے حضرت عثمانؓ کے سامنے لاکر معاملہ پیش کیا۔ آپ نے اس عورت کو زانیہ قرار دے کر حکم دیا کہ اسے رجم کر دیا جائے۔ حضرت علیؓ نے یہ فیصلہ سنا تو فوراً حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچے اور کہا کہ آپ نے یہ کیا فیصلہ کر دیا؟ انہوں نے جواب دیا کہ نکاح کے چھ مہینے بعد اس نے زندہ سلامت بچہ جن دیا۔ کیا یہ اس کے زانیہ ہونے کا کھلا ثبوت نہیں ہے؟ حضرت علیؓ نے فرمایا نہیں۔ پھر انہوں نے قرآن مجید کی مذکورہ بالا تینوں آیتیں ترتیب کے ساتھ پڑھیں۔ سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں۔ اس باپ کے لئے جو رضاعت کی پوری مدت تک دودھ پلوانا چاہے" سورۂ لقمان میں فرمایا "اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے"۔ اور سورۂ احقاف میں فرمایا۔ "اس کے حمل اور اس کا دودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگے"۔ اب اگر تیس مہینوں میں سے رضاعت کے دو سال نکال دیئے جائیں تو حمل کے چھ ماہ باقی رہ جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حمل کی کم سے کم مدت جس میں زندہ سلامت بچہ پیدا ہو سکتا ہے چھ مہینے ہے۔ لہٰذا جس عورت نے نکاح کے چھ مہینے بعد بچہ جنا ہو اسے زانیہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ حضرت علیؓ کا یہ استدلال سنکر حضرت عثمانؓ نے فرمایا، اس بات کی طرف میرا ذہن بالکل نہ گیا تھا۔ پھر آپ نے عورت کو واپس بلوایا اور اپنا فیصلہ بدل دیا۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ کے استدلال کی تائید حضرت ابن عباسؓ نے بھی کی اور اس کے بعد حضرت عثمانؓ نے اپنے فیصلے سے رجوع فرمالیا (ابن جریر احکام القرآن للجصاص، ابن کثیر) ان تینوں آیات کو ملا کر پڑھنے سے جو قانونی احکام نکلتے ہیں وہ یہ ہیں:-

۱۔ جو عورت نکاح سے چھ مہینے سے کم مدت میں صحیح وسالم بچہ جنے (یعنی وہ اسقاط نہ ہو بلکہ وضع حمل ہو) وہ زانیہ قرار پائے گی اور اس کے بچے کا نسب اس کے شوہر سے ثابت نہ ہو گا۔

۲۔ جو عورت نکاح کے چھ مہینے بعد یا اس سے زیادہ مدت میں زندہ سلامت بچہ جنے،

اس پر زنا کا الزام محض اس ولادت کی بنیاد پر نہیں لگایا جا سکتا نہ اس کے شوہر کو اس پر تہمت لگانے کا حق دیا جا سکتا ہے نہ اس کا شوہر بچے کے نسب سے انکار کر سکتا ہے۔

بچہ لازماً اسی کا مانا جائے گا۔ اور عورت کو سزا نہ دی جائے گی۔

(۳) رضاعت کی زیادہ سے زیادہ مدت دو سال ہے۔ اس عمر کے بعد اگر کسی بچے نے کسی عورت کا دودھ پیا ہو تو وہ اس کی رضاعی ماں قرار نہیں پائے گی اور نہ وہ احکام رضاعت اس پر مرتب ہوں گے جو سورۃ نساء آیت ۲۳ میں بیان ہوئے ہیں۔ اس معاملہ میں امام ابوحنیفہؒ نے برسبیلِ احتیاط دو سال کے بجائے ڈھائی سال کی مدت تجویز کی ہے تاکہ رضاعت حرمت جیسے نازک مسئلے میں خطا کر جانے کا احتمال باقی نہ رہے۔"

یہ روایت جسے مودودی مرحوم نے مندرجہ بالا قوانین کی بنیاد قرار دیا ہے، وضعی معلوم ہوتی ہے خود محدثین نے متنِ حدیث پرکھنے کے لئے جو اصول مقرر کئے ہیں ان میں یہ بھی ہیں کہ حدیث عقل، فطرت یا قرینہ کے خلاف نہ ہو (مقام حدیث ص۱۰۶) یہ دعویٰ کہ چھ ماہ کے حمل کے بعد بچہ زندہ ولادت کے قابل ہو جاتا ہے۔ واقعات کے خلاف ہے (OBSTETRICIANS) یعنی ماہرینِ علم جنین اپنے مدتِ مدید کے مشاہدات کے بعد کسی ایسی ولادت کی نشاندہی نہیں کر سکے اور نہ ہی عام لوگوں کے مشاہدہ میں کوئی ایسا واقع ملتا ہے مجھے میڈیکل نکتہ نگاہ سے چند حقائق پیش کرنے کی اجازت دیجئے۔ استقرارِ حمل کے بعد پہلے پانچ ماہ میں جنین کے جسم میں بے شمار تبدیلیاں ہوتی ہیں لیکن چونکہ ان کا زیرِ نظر موضوع کے ساتھ تعلق نہیں اس لئے میں ان کو بیان نہیں کروں گا۔ اس دوران میں دل، آنکھ، کان، بازو، ٹانگیں و دیگر اکثر اعضاء بن چکے ہوتے ہیں۔ پانچ ماہ کے آخر میں جنین کی لمبائی (۸) انچ ہوتی ہے اور وزن ایک پونڈ۔ چہرے کے خط و خال سے اس کی انفرادیت ظاہر ہونے لگتی ہے۔ اس سے اگلے ہفتوں میں، یعنی چھٹے مہینے میں، سانس کی مشینری تیزی سے بننا شروع ہو جاتی ہے۔ اس وقت جنین غنودگی کی حالت میں ہوتا ہے۔ نہ سویا ہوا اور نہ جاگتا ہوا۔ جسم کی حرکات وقفہ وقفہ کے بعد نمودار ہوتی ہیں۔ اصل جاگنے کی حالت آٹھویں یا نویں مہینے میں پیدا ہوتی ہے۔ اور ان مہینوں میں جلد کے نیچے چربی بڑھ جاتی ہے اور جنین گول مٹول شکل اختیار کرتا جاتا ہے۔ پانچ ماہ کے بعد دماغ کے (SULCI) پیدا ہونے شروع ہوتے ہیں اور سات ماہ تک اہم قسم کے (SULCI) پہچانے جاتے ہیں۔ یہ SULCI کیا ہوتے ہیں میں اس کی وضاحت کئے دیتا ہوں جسم کا ہر حصہ نشوونما کے بعد بڑا ہوتا جاتا ہے اور اس کا حجم بڑھتا جاتا ہے اور یہ زیادہ سے زیادہ جگہ گھیرتا جاتا ہے لیکن دماغ کھوپڑی

کی ہڈیوں کے اندر محبوس ہوتا ہے اور کھوپڑی کی ہڈیاں بچے کی پیدائش کے کچھ مدت بعد آپس میں مل کر ایک بند بکس بنا دیتی ہیں۔ لیکن اس کے بعد بھی دماغ کو جتنا استعمال کیا جائے اُتنا بڑھتا جاتا ہے لیکن اس کے بڑھنے سے حجم میں زیادتی نہیں ہوتی بلکہ اس کا (SURFACE AREA) یعنی اس کی سطح بڑی ہوتی جاتی ہے۔ حجم ایک خاص مدت تک کچھ بڑھتا ہے لیکن چونکہ بند بکس کے اندر ہوتا ہے اس لئے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ (SURFACE AREA) سطح کے بڑھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں اونچ نیچ پیدا ہو جاتی ہے۔ اس اونچ نیچ میں جو اونچی جگہیں (انہیں پہاڑیاں کہہ لیجئے) ہوتی ہیں ان کو (GYRI) کہتے ہیں اور جو نیچی جگہیں (ان کو وادیاں کہہ لیجئے) ہوتی ہیں ان کو (SULCI) کہتے ہیں چونکہ انسان کا دماغ استعمال کے نتیجے میں بڑھتا رہتا ہے اور اس میں سے نئے نئے مراکز پیدا ہوتے رہتے ہیں اس لئے (SULCI) اور (GYRI) صرف انسان کے دماغ میں ہوتے ہیں، حیوانات کے دماغ میں نہیں ہوتے۔ دماغ کی سطح میں یہ اونچ نیچ پیدائش سے پہلے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ مندرجہ بالا سطور سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ سب سے بڑی کمی جو چھ ماہ کے بچے میں ہوتی ہے وہ دماغ کی نشوونما کی کمی ہوتی ہے۔

بچے کی پیدائش کے سلسلہ میں علوم جنین کے ماہرین جس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہ حسب ذیل ہے۔

انسانی بچے کی پیدائش کا صحیح وقت استقرار حمل کے ۲۸۰ دن بعد ہوتا ہے یعنی ۴۰ ہفتے یا دس "ماہواری چکر"۔ ۲۸ ہفتے کے بعد جنین کا وزن ۱۴۰۰ گرام ہوتا ہے جلد کے نیچے چربی بڑھ رہی ہوتی ہے خصیے ابھی INGUINAL CANAL (یعنی وہ راستہ جو پیٹ کے اندر سے فوطوں کی طرف جاتا ہے) میں ہوتے ہیں ابھی فوطوں کے اندر نہیں پہنچے ہوتے۔ لیکن ایسا بچہ جو استقرار حمل کے ۲۸ ہفتے بعد پیدا ہو جائے اسے (VIABLE) یعنی زندہ ولادت کے قابل کہا جا سکتا ہے۔ اور عام قانون اسے (VIABLE) تسلیم بھی کرتا ہے۔ گو (۲۸) ہفتے کے بعد پیدا ہونے والا بچہ شاذونادر ہی زندہ رہتا ہے۔ البتہ (۳۶) ہفتے کے بعد پیدا ہونے والے بچے اکثر زندہ رہ جاتے ہیں۔ بحوالہ (OBSTETRICS BY TEN TEACHERS 12th EDITION-1976)

مندرجہ بالا اقتباس علوم جنین کے ماہرین کے صدیوں کے مشاہدات کا نچوڑ ہے اس کی رُو سے، پیدا ہونے والا بچہ کم از کم ۲۸ ہفتے ماں کے پیٹ میں رہے تو اس کے زندہ رہنے کا امکان ہو سکتا ہے۔ اب آپ حساب لگائیے کہ شمسی کیلنڈر کے مطابق چھ ماہ (یکم جنوری تا ۳۰ جون) کے صرف ۲۶ ہفتے بنتے ہیں اور قمری کیلنڈر کے مطابق ۲۵ ہفتے

اور دوسرا سوال یہ ہے کہ آیا وہ بچہ جس کا مودودی مرحوم نے ایک روایت کے مطابق ذکر کیا ہے دنیا کا واحد بچہ تھا جو استقرارِ حمل سے چھ ماہ بعد پیدا ہونے پر زندہ و سلامت رہا۔ اگر کوئی شخص ایسے واقع کی کوئی دوسری مثال پیش کر سکے تو میں اس کا شکر گزار ہوں گا۔ علاوہ ازیں اگر بفرضِ محال تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اس قسم کے بچے کا زندہ رہنے کا امکان ہے، تو بھی یہ قانون کیسے بنایا جا سکتا ہے کہ جو عورت نکاح کے چھ ماہ بعد یا اس سے زیادہ مدت میں زندہ سلامت بچہ جنے اس پر زنا کا الزام محض اس کی ولادت کی بنیاد پر نہیں لگایا جا سکتا... بچہ لازماً اسی کا مانا جائیگا۔ کیا قوانین غیر الوقوع یا غیر معمولی واقعات کی بناء پر بھی مرتب کئے جا سکتے ہیں؟

اب آیئے ان آیات قرآنی کی طرف جن کو اس مفروضے کی بنیاد بنایا گیا ہے یعنی (۲:۲۳۳، ۳۱:۱۴ اور ۴۶:۱۵) آیت ۲:۲۳۳ اور اس سے اگلی پچھلی آیات میں طلاق کے قواعد و ضوابط بیان کئے گئے ہیں۔ اس آیت میں کہا گیا ہے کہ مائیں بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں۔ یہ حکم اس شخص کے لئے ہے جو پوری مدت تک دودھ پلوانا چاہے اور دودھ پلانے والی ماں کا کھانا کپڑا دستور کے مطابق باپ کے ذمہ ہوگا۔ صاف ظاہر ہے کہ بچے کو دودھ پلانے کی مدت یہاں مخصوص شرائط کے تحت ہے اور اگر ماں باپ باہمی رضامندی سے دودھ پلانے کا کوئی متبادل انتظام کرنا چاہیں تو اس کی بھی اجازت ہے۔

اب آیت ۳۱:۱۴ کو لیجئے "ہم نے انسان کو اپنے والدین سے بھلائی کی تاکید کی ہے اس کی ماں اسے تکلیف پر تکلیف سہ کر پیٹ میں اٹھائے رکھتی ہے اور دو برس میں اس کا دودھ چھڑانا ہوتا ہے"۔ اس آیت کا بنیادی تصور ماں باپ سے حسن سلوک کا ہے کیونکہ وہ بچے کی پرورش کی خاطر مدت تک تکلیف گوارا کرتے ہیں۔ اس آیت میں یہ الفاظ کہ "دو برس میں بچے کا دودھ چھڑانا ہوتا ہے" صرف بچے کی جسمانی نشوونما کی مطابقت کی وجہ سے ہیں کیونکہ بچے کے دودھ کے دانتوں کا نکلنا دو برس میں پورا ہوتا ہے جو اس امر کا ایک قدرتی نشان ہے کہ اب بچہ دودھ کے علاوہ دوسری غذا کھانے کے قابل ہو گیا ہے اور یہ ایک قدرتی حد ہے جہاں رضاعت کی مدت ختم ہوتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن نے دو سال سے کم یا زیادہ مدت کے لئے دودھ پلانے کی ممانعت کر دی ہے اور نہ ہی یہ اس نوعیت کا (FIXED PERIOD) مقرر شدہ وقت ہے جیسا کہ بچے کی پیدائش کا وقت ہے۔ گو دو سال تک ماں کا دودھ پلانا ایک مفید عمل ہے لیکن فی زمانہ بہت کم مائیں اس پر عمل کرتی ہیں اور ایسی مائیں قرآن کی خلاف ورزی کی مرتکب نہیں ہوتیں متعین طور پر دو سال تک دودھ پلانے کا حکم صرف ان حالات کے تحت ہے جن کا ذکر آیت (۲:۲۳۳) میں ہے اور یہ واقع کہ امام ابو حنیفہؒ نے یہ مدت دو سال سے بڑھا کر ڈھائی سال کر دی تھی ظاہر کرتا ہے کہ دو سال کی مدت مشروط ہے اور اس میں کمی بیشی بھی کی جا سکتی ہے۔

اب لیجئے آیت (۴۶:۱۵)۔ "ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ بھلائی کا حکم دیا ہے

اس کی ماں نے تکلیف سے اسے پیٹ میں رکھا اور تکلیف سے اسے جنا اور اس کا پیٹ میں رہنا اور دودھ چھوڑنا تیس ماہ میں ہوتا ہے۔" یہاں سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کیا تکلیف اور مشقت کا وقت قرارِ حمل کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے یہ معلوم ہے کہ حمل کے پہلے ۳ مہینے مشقت کے مہینے نہیں ہوتے گو ان مہینوں میں ماں کے جسم میں تغیرات ضرور ہوتے ہیں۔ قرآن بھی ایامِ حمل کو دو حصّوں میں تقسیم کرتا ہے (۱) ہلکا بوجھ اور (۲) بھاری بوجھ۔ چنانچہ کہا گیا ہے۔ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِیَسْكُنَ اِلَیْهَا فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِیْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ فَلَمَّاۤ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَىِٕنْ اٰتَیْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ۔ (۷ : ۱۸۹)

"وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تم کو ایک جرثومۂ حیات (LIFE CELL) سے پیدا کیا اور اسی میں سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ اس سے راحت حاصل کرے۔ تو جب وہ اس سے ملتا ہے تو اسے ہلکا سا حمل رہ جاتا ہے اور وہ اس کے ساتھ چلتی پھرتی ہے پھر جب وہ بوجھ معلوم کرتی ہے (یعنی بچہ بوجھل ہو جاتا ہے) تو دونوں میاں بیوی اپنے پروردگار سے التجا کرتے ہیں کہ اگر تو ہمیں صالح بچہ دے گا تو ہم تیرے شکرگزار ہوں گے۔"

ایامِ حمل کی تکلیف اور مشقت کی مدت چھ مہینے کی ہوتی ہے جب بچہ بوجھل ہو جاتا ہے۔ یہ مشقت کے چھ ماہ اور دودھ پلانے کے ۲۴ ماہ ملا کر ۳۰ مہینے بنتے ہیں

اس سلسلہ میں مودودی (مرحوم) مزید لکھتے ہیں۔

اس مقام پر جان لینا فائدے سے خالی نہیں ہوگا کہ جدید ترین طبی تحقیقات کی رُو سے ماں کے پیٹ میں ایک بچے کو کم از کم (۲۸) ہفتے درکار ہوتے ہیں جن میں وہ نشو و نما پا کر زندہ ولادت کے قابل ہو سکتا ہے۔ یہ مدت ساڑھے چھ مہینے سے کچھ زیادہ بنتی ہے۔ اسلامی قانون میں نصف ماہ کی مزید رعائت دی گئی ہے کیونکہ ایک عورت کا زائچہ قرار دینا اور بچے کا نسب سے محروم ہو جانا بڑا سخت معاملہ ہے اور اس کی نزاکت یہ تقاضا کرتی ہے کہ ماں اور بچے کو اس کے قانونی نتائج سے بچانے کے لئے زیادہ سے زیادہ گنجائش دی جائے۔

مودودی مرحوم نے جس روایت کو پہلے پیش کیا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ حضرت علیؓ نے قرآن کریم سے یہ استدلال کیا کہ حمل کی کم از کم مدت جس میں زندہ سلامت بچہ پیدا ہو سکتا ہے، چھ مہینے ہے۔ وہ اب فرما رہے ہیں کہ جدید ترین طبی تحقیقات کی رُو سے ماں کے پیٹ میں ایک بچے کو ساڑھے چھ مہینے سے کچھ زائد عرصہ درکار ہوتا ہے جس میں وہ صحیح سالم شکل میں پیدا ہو سکتا ہے۔ آپ سوچئے کہ اس کی زد کہاں تک پہنچتی ہے۔ یعنی (اس روایت کی رُو سے) اللہ تعالیٰ

کو بھی (معاذ اللہ) معلوم نہیں تھا کہ یہ عرصہ کتنا ہوتا ہے اس نے چھ ماہ کہدیا حالانکہ طبی تحقیقات کی رُو سے یہ عرصہ ساڑھے چھ ماہ سے بھی زائد ہوتا ہے۔

پھر اس چھ ماہ کو قانون کی بنیاد بنانے کے لئے ایک امر واقع (طبی تحقیق) میں سے نصف ماہ سے زائد عرصہ کم کرنا پڑا۔ یوں یہ قانون بنا کہ نکاح کے چھ ماہ بعد بھی عورت صحیح سالم بچہ جنے تو نہ عورت کو زانیہ قرار دیا جا سکتا ہے، نہ اس بچے کو ناجائز اولاد۔ یعنی پہلے ایک ناممکن کو ممکن فرض کیا۔ پھر اس ناممکن پر قانون کی بنیاد رکھی اور اس کی متزلزل دیوار کو سہارا دینے کے لئے از خود اس میں نصف ماہ سے زائد کی گنجائش رکھ دی۔ اور اس کا نام رکھا اسلامی قانون شریعت! آپ نے غور فرمایا کہ ہماری ان روایات کی حیثیت کیا ہے اور ان پر متفرع قوانین کی حقیقت کیا ہے؟ ان حضرات کو قطعاً خیال نہیں آتا کہ اس سے دنیا اسلام کے متعلق کیا رائے قائم کرتی ہے، اور ارباب علم و تحقیق کی نظروں میں ہمارے اس قسم کے قوانین کا مقام کیا قرار پاتا ہے!

اس کے بعد مودودی مرحوم لکھتے ہیں:

> علاوہ بریں کسی طبیب، کسی قاضی، حتیٰ کہ خود حاملہ عورت اور اسے بار بار کرنے والے مرد کو بھی معلوم نہیں ہو سکتا کہ استقرارِ حمل کس وقت ہوا[1] یہ بات بھی اس امر کی متقاضی ہے کہ حمل کی کم از کم قانونی مدت کے تعین میں چند روز کی گنجائش رکھی جائے۔

ایک شخص کا یکم جنوری کو نکاح ہوتا ہے اور (۳۰) جون کو اس کی بیوی کے ہاں صحیح سالم بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔ کیا مودودی مرحوم کے متبعین میں سے کوئی صاحب بتا سکتے ہیں کہ اس میں "چند روز کی گنجائش" کا سوال کیسے پیدا ہوگا؟ کیا اس بچے کو اس شخص کا بیٹا تسلیم کیا جائیگا جس کا، اس کی والدہ کے ساتھ نکاح یکم جنوری کو ہوا تھا؟

طلوعِ اسلام:

ڈاکٹر عبدالودود صاحب نے اپنے موضوع کو بڑی عمدگی سے بیان فرمایا ہے۔ اس میں دو ایک مقام البتہ ایسے ہیں جہاں ان کا اجمالی قدرے تفصیل کا متقاضی ہے۔

(رضاعت کے ایک مقام کے سوا) قرآن کریم نے رضاعت اور حمل کی مدت کو قانونی حیثیت سے بیان نہیں کیا۔ انہیں دیگر مقاصد کے سلسلہ میں ضمناً بیان کیا ہے۔ رضاعت کی استثنا وہاں ہے جہاں کہا گیا ہے کہ مطلقہ (یا بیوہ) عورت اپنی آغوش کے شیر خوار بچے کو دودھ پلائے اور اس کا معاوضہ بچے کا باپ (یا اس کا وارث) ادا کرے۔ چونکہ

---

[1] حاملہ عورت کو تو معلوم ہو جاتا ہے۔ ویسے اب اس کے لئے ٹسٹ بھی ایجاد ہو چکے ہیں (طلوعِ اسلام)

اس معاملہ کی حیثیت قانونی ہو جاتی ہے۔ اس لئے اسکے لئے فرمایا کہ معمولاً یہ مدّت دو سال کی ہو گی جس میں باہمی مفاہمت سے کمی بیشی کی جا سکتی ہے۔ (ملاحظہ ہو سورۃ بقرہ آیت ۲۳۳) حمل کی مدّت کے لئے اس نے اتنا بھی نہیں کہا حتیٰکہ اس نے حمل کا لفظ اس کے اصطلاحی (PREGNANCY کے) معنوں میں استعمال نہیں کیا۔ اس کے لغوی (بوجھ اٹھانے کے) معنوں میں استعمال کیا ہے، مثلاً حَمَلَتْهُ أُمُّهُ (۴۶/۱۵ ؛ ۳۱/۱۴) "اس کی (جنین کی) ماں اسے اٹھاتی ہے" اور حَمْلُهُ (۴۶/۱۵)۔ میں "ماں کا حمل" نہیں کہا۔ "جنین کا حمل" کہا ہے۔ یعنی بچے کا بوجھ جسے ماں اٹھاتی ہے اس سے اس لفظ کا اصطلاحی مفہوم مستنبط کیا جاتا ہے۔

۲۔ اس بوجھ کو قرآن نے دو مراحل میں تقسیم کیا ہے۔ مرحلۂ اول کو اس نے "حملِ خفیف" سے تعبیر کیا ہے جس میں عورت بلا دقت اور بلا تکان چلتی پھرتی رہتی ہے (فَمَرَّتْ بِهِ ۷/۱۸۹) دوسرا مرحلہ حملِ ثقیل کا ہے۔ اس کے متعلق کہا ہے کہ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا (۴۶/۱۵)۔ اس کی ماں اس بوجھ کو بہ مشقت اٹھاتی ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ (۳۱/۱۴)۔ اس کی ماں اس کے بوجھ کو اٹھاتی ہے تو تھک جاتی ہے، کمزور ہوتی جاتی ہے۔

لہٰذا قرآن کریم نے جہاں حمل و رضاعت کی مدّت تیس ماہ بتائی ہے تو اس سے حملِ ثقیل کی مدّت کی طرف اشارہ ہے۔ قرآن کریم کے الفاظ ہیں: حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا (۴۶/۱۵) اس کی ماں نے اس کے بوجھ کو بہ مشقت اٹھایا اور اسے بہ مشقت جنا۔ اور اس بوجھ کے اٹھانے اور دودھ چھڑانے کی مدّت تیس ماہ ہے۔ حملِ خفیف کے دوران تو اس بوجھ (جنین) کا چنداں احساس بھی نہیں ہوتا کیونکہ (قرآن نے کہا ہے) کہ جب یہ حملِ ثقیل ہو جاتا ہے تو اس کے ماں باپ خدا سے دعا مانگتے ہیں کہ بچہ صحیح سالم پیدا ہو (۷/۱۸۹)

طبی تحقیق کی رُو سے حملِ خفیف کی مدّت قریب تین ماہ ہوتی ہے اور حملِ ثقیل کی (معمولاً) چھ ماہ۔ یہ چھ ماہ اور رضاعت کے (معمولاً) چوبیس ماہ، مل کر تیس ماہ بن جاتے ہیں۔

متعلقہ آیات کا یہ مفہوم لینے سے، نہ کوئی الجھاؤ پیدا ہوتا ہے، نہ قرآن میں (معاذاللہ) تضاد واقع ہوتا ہے، نہ ہی "چھ ماہ کے حمل" کو جائز قرار دینے کے لئے ایسا قانون بنانا پڑتا ہے جو فطرت کے بھی خلاف ہو اور تحقیقات و مشاہدات کے بھی خلاف۔

حمل کے جائز یا ناجائز قرار دینے کے لئے قانون مرتب کرنا ہو تو اس کے لئے ماہرینِ علم جنین کی رائے لینی چاہیئے۔"

بہرحال ہم اپنی بصیرت کے مطابق ان آیات کا یہی مفہوم سمجھتے ہیں' ورنہ اسے تو ایک ثانیہ کیلئے بھی باور نہیں کیا جا سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہو کہ چھ ماہ کے حمل کے بعد صحیح سالم بچہ پیدا ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ ان آیات میں کسی نادر الوقوع استثنائی بچہ کی ولادت کا ذکر نہیں۔ قرآن نے معمول کی بات کی ہے یعنی یہ کہ ایسا ہوتا ہے۔ اس نے ہر بچہ (بلکہ جوان، یا ہر انسان) سے کہا ہے کہ تمہاری پیدائش اور رضاعت کی یہ مدت تھی۔